جلد ۸۷ مارچ ۱۹۷۷ عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

کیا

- آپ نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے جس کی بدولت بہت سے مشرکین مشرف باسلام ہو چکے ہیں؟
- جو دنیا کی ۲۲ زبانوں میں چھپ چکی ہے۔
- جس کی کروڑوں جلدیں دنیا کے گوشے گوشے میں زیرِ مطالعہ ہیں۔

آپ بھی اپنے دینِ اسلام کی حقیقت کو جاننے کے لیے آج ہی

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف

دینیات

کا مطالعہ کیجیے

جامع مگر مختصر اور عام فہم تشریحات سے آراستہ [illegible]
جسے عام اردو دان بھی سمجھ سکتا ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی شوق و ذوق
سے پڑھتے اور اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں [illegible]
منظور شدہ۔ ہر بک اسٹال سے دستیاب۔ قیمت ۶ روپے۔

اِدارۂ ترجمان القرآن، اِچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۷ | مارچ ۱۹۷۷ء مطابق ربیع الاول ۱۳۹۷ھ | عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵- اے ذیلدار پارک، اچھرہ- لاہور

فون نمبر —— ۴۱۱۰۱۶ —— ۴۱۱۰۱۷

زرسالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۲۵/۱ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انتخابات کے سرکاری نتائج خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن رائے عامہ کی عدالت نے نہایت واضح طور پر پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف فیصلہ دے دیا ہے۔ اس پارٹی، اس کے قائد اور اُن کے اعوان و انصار کے بارے میں عوام کے جذبات میں یہ حیران کن تغیر چند سطحی وجوہات کی بنا پر رونما نہیں ہوا، یہ بعض فطری اسباب کا منطقی نتیجہ ہے جو حکمران جماعت کے خلاف شدید نفرت کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

پیپلز پارٹی کے اس حسرتناک زوال کا پہلا سبب یہ ہے کہ اُس کے قائد نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ایک آدمی دلفریب وعدے کرنے میں جس قدر فیاض ہو، الفاظ کے استعمال میں جس قدر مُطلق العنان ہو اور عوامی جذبات سے کھیلنے میں جس نسبت سے مشاق ہو، اُسی تناسب سے وہ عوام میں مقبول ہوتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں چونکہ ان حربوں کو بڑا مفید اور کارگر پایا اور ان کی بدولت ہی انہیں اقتدار نصیب ہوا اس لیے وہ عوامی مقبولیت کے نشے اور اقتدار کی مستی میں یہ حقیقت بالکل بھول گئے کہ زندگی خیالوں کی جنت نہیں بلکہ ٹھوس حقائق سے عبارت ہے اس لیے لوگوں کو خوش کن نعروں کے بل بوتے پر کچھ دیر کے لیے تو بیوقوف بنایا جاسکتا ہے، مگر طویل مدت تک انہیں دھوکہ میں نہیں رکھا جاسکتا۔ زندگی کے بے رحم تقاضے جلد ہی سامنے آکر فریب کاریوں کے سارے پردے چاک کر دیتے ہیں۔ ہر انسان خواہ وہ شعور کی کسی سطح پر ہو، سب سے پہلے عزت و آبرو اور جان و مال کا تحفظ چاہتا ہے۔

پھر وہ اِس بات کا طالب ہوتا ہے کہ کسی قدر وقار کے ساتھ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز احتیاجات پوری کر سکے۔ اُس کی اولاد جب جوان ہو تو اُن کی صلاحیتوں کو تعمیری مقاصد میں لگانے کا معقول انتظام ہو۔ مادّی ضروریات کی یہ کم سے کم مقدار ہے جسے ہر انسان پورا کرنے کا شدید آرزومند ہوتا ہے۔ اور اگر ان ضروریات کو پورا کرنے کا اُسے سامان میسّر نہ آئے تو اُس کے اندر اُن لوگوں کے خلاف شدید ردِّ عمل پیدا ہوتا ہے جن کے ہاتھ میں معاشرے اور حکومت کی زمام کار ہوتی ہے۔

"قائدِ عوام نے انسان کی اِن بنیادی ضروریات کے بارے میں اُس کے نازک احساس کا پوری طرح اِدراک کرتے ہوئے عوام سے ایسے وعدے تو کر لیے جن میں اُنہیں پورا کرنے کی یقین دہانی کرائی گئی، لیکن اِس سلسلے میں عملی طور پر کچھ نہ کیا گیا بلکہ اُن وعدوں کی دلفریبیوں میں عوام کو اُلجھا کر وقت گزارنے کی کوشش کی گئی۔ بھٹو صاحب نے اِس حقیقت پر غور کرنا قطعاً گوارا نہ کیا کہ لوگوں کے صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور اُس کا پیمانہ جب لبریز ہو کر چھلکتا ہے تو بڑے خوفناک طوفان اُٹھا دیتا ہے۔

پھر "فخرِ ایشیا" نے اپنے مواعید کو پورا کرنے کے لیے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں اور اُن کے بارے میں عوام کے اندر جو شدید ردِّ عمل پیدا ہوا ہے اُس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کے نتائج ہر شخص ہر آن دیکھتا اور اُن کے اثرات کو زندگی کے ہر گوشے میں پوری شدّت سے محسوس کرتا ہے۔ اِس بنا پر محض الفاظ کی بازیگری سے عوام کو دھوکہ نہیں دیا جا سکتا، مثلاً عوام کے ساتھ روٹی، کپڑے اور مکان کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا وعدہ تھا جس کے عملی مضمرات کو معاشرے کا ہر فرد پوری طرح سمجھتا تھا اور توقع رکھتا تھا کہ حکومت ایسی تدابیر اختیار کرے گی جن سے اُس کی خوراک، لباس اور رہائش کا مسئلہ بآسانی حل ہو جائے گا مگر ہوا یہ کہ گندم، چینی، چاول اور دیگر اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں اس حد تک اضافہ کر دیا گیا جس کا عوام تصور تک نہ کر سکتے تھے۔ اِس ہوشربا مہنگائی کے بعد عوام کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت نے

روٹی پلانٹ لگا کر روٹی کا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام محض اس طرح کے بیانات سے تو مطمئن نہیں ہو سکتے بلکہ وہ اِسے اپنی بے بسی پر ایک بھرپور طنز سمجھتے ہیں اور مجبوری کے عالم میں سوچنے لگتے ہیں، کیا اُن کا "محبوب قائد" اُن کی عقل و خرد پر خندہ زن ہونے کے علاوہ اُن کی بے کسی اور بیچارگی کا بھی مذاق اُڑا رہا ہے۔ اُنہیں عوام کی محبت کے اِس دعویدار سے بجا طور پر توقع تھی کہ جب وہ مسندِ اقتدار پر براجمان ہوگا تو غریبوں کے مصائب و شدائد دُور ہوں گے اور اُن کے لیے زندگی کی آسانیاں پیدا ہوں گی، مگر افسوس کہ نتائج اُن مصیبت زدوں کی توقعات کے بالکل برعکس نکلے۔ زندگی اُن کے لیے سراپا عذاب بن کر رہ گئی۔ روزمرّہ کی ضروریات فراہم کرنے کے لیے انہیں نہ صرف پانچ گنا دام ادا کرنے پڑے، بلکہ جوانوں، بوڑھوں اور بچوں کے علاوہ بہو، بیٹیوں کو ڈپوؤں پر پہروں لائن میں کھڑا کر کے اُن اشیاء کو بڑی دِقت، کشمکش اور منت سماجت کے ساتھ حاصل کرنا پڑا۔ اِس تشویشناک صورتِ حال نے جو ملک کے ہر شہری کو ہر روز پیش آتی ہے عوام میں حکومت کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کر دی ہے۔

بھٹو صاحب کی مقبولیت کو نفرت اور حقارت میں بدلنے کے لیے اُن کی پارٹی اور اُن کے جاں نثار بھی بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ انہیں اُن کے ناقدین نے عوام کی نظروں میں اتنا نہیں گرایا جتنا کہ اُن کے مدّاحوں نے اُن کی شہرت کو نقصان پہنچایا ہے، تو اِس میں قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اُنہیں بعض داخلی اور خارجی وجوہ کی بنا پر مغربی پاکستان میں جو غیر متوقع کامیابی نصیب ہوئی، اُس نے خود اُنہیں اور اُن کے یمین و یسار میں جو لوگ تھے اُنہیں غیر حقیقت پسندانہ طرزِ فکر اور غیر حقیقت پسندانہ طرزِ عمل کا خوگر بنا دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنا پانچ سالہ دَورِ حکومت جس آمرانہ ذہن اور عوامی مسائل سے بے نیازی کے ساتھ گزارا اُسے دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ وہ اقتدار کو اپنی ذاتی ملکیت کی کوئی چیز سمجھ بیٹھے تھے اور رائے عامہ کے متعلق اُن کے ذہن میں یہ خیال پرورش پا چکا تھا کہ یہ ایک مَرکب ہے جس کے وہ تنہا راکب ہیں اور جب چاہیں گے اور جس طرح چاہیں گے بڑی آسانی سے اس کی عنان موڑ دیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے بارے میں کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو گئے اور اِس غلط فہمی

میں گرفتار ہو کر وہ سارا عرصہ حکومت کرتے رہے۔ اُن کے آمرانہ ذہن نے اپنے خلاف کسی بات کو سُننا بھی گوارا نہ کیا۔ "انا ولا غیری" کا دعویٰ صرف ایک ذاتِ بے ہمتا کو ہی زیب دیتا ہے، لیکن جب قوت و اختیار کی بدمستی میں حکمران یہ بڑا بول بولنے لگتے ہیں تو وہ راہِ راست سے ہٹ کر جس اندوہناک انجام سے خود دوچار ہوتے ہیں اور قوم کو دوچار کرتے ہیں، اُس سے کون ناواقف ہے۔ لیکن بھٹو صاحب نے اِن حقائق سے کوئی عبرت نہ پکڑی۔ وہ اپنے آپ کو کبریائی کے مقام پر فائز سمجھتے ہوئے اُمورِ سلطنت چلاتے رہے۔ اُنہوں نے اپنے آپ کو عقلِ کُل، ہر خطا سے مُبرّا اور ہر عیب سے مُنزّہ سمجھا۔ اگر کسی نے اُنہیں کسی بات پر ٹوکنے کی جسارت کی تو اُس پر ایسا شدید عتاب نازل کیا جسے دیکھ کر دوسرے لوگ دہل گئے۔

بھٹو صاحب کی اِس کج فکری اور کج عملی سے معاشرے میں جو خوفناک بگاڑ پیدا ہوا وہ تو خیر ہوا ہی تھا، اُس کی رہی سہی کسر اُن کے بہی خواہوں نے پوری کر دی۔ گذشتہ انتخابات میں بھٹو صاحب نے عوام کے اندر جس طرح ذہنی اور جذباتی ہیجان پیدا کر کے اپنے وابستگان کو ایوانِ اقتدار تک پہنچایا اُس سے وہ یہ سمجھنے لگے کہ طاقت کا اصل سرچشمہ صرف اُن کے قائد کی ذاتِ گرامی ہے۔ وہ جس کو چاہیں اقتدار سے نوازیں اور جسے چاہیں اُس سے محروم کر دیں۔ اِس لیے اُنہوں نے عوام کے مسائل، اُن کی مشکلات اور اُن کی پریشانیوں اور اُن کے احساسات کی طرف کوئی توجہ دینے کے بجائے وزیرِ اعظم کی خوشنودی حاصل کرنے میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دیں اور اِس معاملے میں عزتِ نفس، خودداری، غیرت اور حمیت، الغرض شرافت کی ہر قدر کو داؤ پر لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ آمر چونکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے انتہائی خوشامد پسند ہوتا ہے اور اپنے بارے میں مدح و ستائش کی حکایتوں کے علاوہ کچھ سُننا گوارا نہیں کرتا، اِس لیے اُن کے حاشیہ نشینوں نے بھٹو صاحب کی تعریف و توصیف میں آسمان زمین کے قلابے ملا دیے اور اُنہیں ہر آن یہی باور کراتے رہے کہ وہ مُلک کے سارے باشندوں کی آنکھ کا تارا ہیں۔ ہر فرد اُن کی محبت میں فنا ہو رہا ہے اور جو شخص اُن کی عظمت کا قائل نہیں عوام صبح و شام اُس پر ہزار ہزار لعنتیں بھیجتے ہیں۔ اُن کی ذاتِ ستودہ صفات ہی اِس ارضِ پاکستان میں، بلکہ ایشیا اور دُنیائے اسلام میں محبت و

عقیدت کا واحد مرکز بن گئی ہے۔ اُن کے فہم و تدبّر پہ پوری دُنیا کو نہ سہی تیسری دُنیا کے ہر فرزند کو ضرور ناز ہے۔ وہ مظلوم انسانوں کے نجات دہندہ بن کر دُنیا کے سینے پہ اُبھرے ہیں اور اہلِ پاکستان کو اس بات پہ فخر ہے کہ انہیں مدّت دراز کے بعد ایک ایسا قائد ملا ہے جو نہ صرف پاکستان کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سلامتی کے ساتھ ساحلِ مُراد تک پہنچانے کا حوصلہ رکھتا ہے، بلکہ اپنی بے مثال ذہانت اور فطانت سے پوری دُنیا کے دُکھوں کا مداوا بھی کر سکتا ہے۔ ہر شخص جو کسی نہ کسی وجہ سے پیپلز پارٹی اور اقتدار کے ساتھ وابستہ ہے، وہ اِسی لئے ہیں وزیر اعظم بھٹو کے گُن گانے کو اپنا کمال سمجھتا ہے۔ اُسے اِس سے کچھ غرض نہیں کہ وہ اپنے ممدوح کی جو خوبیاں کر رہا ہے وہ فی الحقیقت اُن میں ہیں بھی یا نہیں، یا وہ فی الواقع دل میں اُن کا معترف بھی ہے۔ اُسے تو صرف ایک ہی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اُسے کسی طرح قائدِ عوام کا قرب حاصل ہو اور اگر یہ بلند مرتبہ اُسے پہلے سے حاصل ہے تو اُس کے درجات میں مزید ترقی ہو، تاکہ وہ اُن کا منظورِ نظر بن کر زیادہ سے زیادہ ناجائز فوائد حاصل کر سکے۔

اِس منفی طرزِ فکر نے ممدوح اور اُن کے ثنا خوانوں سب کو اچھا خاصا نقصان پہنچایا۔ بھٹو صاحب کو یہ نقصان پہنچا کہ وہ بے ضمیر خوشامدیوں کے نرغے میں گھِر کر ملک و ملّت کے حقیقی بہی خواہوں سے دُور ہو گئے جو اُن کی خوشامد پہ تو آمادہ نہ تھے مگر اُنہیں اصل حقائق سے باخبر رکھ کر قوم کی فلاح و بہبود کے لیے اُنہیں بہترین مشورے دے سکتے تھے۔ اگر اُن باضمیر حضرات کی باتوں کو ہمدردی اور توجہ سے سُنا جاتا اور اُن پہ ٹھنڈے دل سے غور کر کے اُن کے مطابق اصلاحِ احوال کی کوشش کی جاتی تو آج "قائدِ عوام" کو یہ بُرے دن نہ دیکھنے پڑتے جو اب دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ اقتدار اُنہیں حاصل ہوتا ہے یا نہیں، یہ الگ بحث ہے لیکن اِس امر سے آخر کون انکار کر سکتا ہے کہ اُن کے خلاف جذبات کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب اُمڈ پڑا ہے جس کے سامنے بند باندھنا اُن کے لیے ممکن نہیں رہا۔ وہ خود ہی سوچیں، اگر وہ یونانی دیوتاؤں کی سی خود پسندانہ اور متکبرانہ روش اختیار کرنے کے بجائے اپنے آپ کو محدود عقل و خرد رکھنے والا انسان سمجھتے اور ہر مخالف کو ملک و ملّت کا دشمن قرار دے کر اُسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کے بجائے اُس کی رائے کو درخورِ اعتناء

سمجھتے تو کیا حالات کا نقشہ اِس سے بالکل مختلف نہ ہوتا جو آج کل ہمارے سامنے ہے۔ خسروانہ جاہ وجلال میں اگر وہ اِس حقیقت کو بھی سامنے رکھتے کہ وہ بہر حال خدا کے بندے ہیں، لہٰذا ان سے غلطی کا ارتکاب ہوسکتا ہے اور اِس بناء پر وہ باضمیر اہل الرّائے کے صلاح ومشورہ کے محتاج ہیں تو ایسی صورت میں وہ اپنی صلاحیتیں نمائشی کاموں میں کھپانے کے بجائے تعمیری کاموں میں صرف کرتے اور قومی خزانہ بھی اِس طرح برباد نہ ہوتا جس طرح اُن کے ہاتھوں ہوا ہے۔ مگر اُن کے آمرانہ مزاج نے یہ معقول طرزِ عمل اختیار کرنے سے عمداً گریز کیا اور ماضی کے بگڑے ہوئے بادشاہوں کی طرح اپنے اردگرد ایسے لوگ جمع کیے جو قصیدہ خوانی کے فن میں ماہر تھے، اور اُن کی نیازمندی پر بھروسہ کرتے ہوئے جو جی میں آیا اصلاحات کے نام پر بلاتکلف کرتے چلے گئے۔ بے تدبیری کے ساتھ کی گئی یہ اصلاحات جب ناکام ثابت ہوئیں، اور اُن کی ناکامیوں کے اثرات عوامی زندگی پر مترتب ہونے لگے تو اُن کوتاہیوں کو چھپانے کے لیے ایک طرف تو عوام کی توجہ میلوں ٹھیلوں، کھیل تماشوں، میناروں کی تعمیر جیسے سطحی کاموں کی طرف لگانے کی کوشش کی گئی اور دوسری طرف اِس امر کا التزام کیا گیا کہ اُن غلطیوں پر کوئی شخص لب کشائی کی جرأت نہ کر سکے اور کوئی فرد اگر زبان کھولے تو صرف تعریف وتوصیف ہی میں کھولے۔ کسی ایک شخص کی لغزش جو فقط اُس کی ذات پر، یا زیادہ سے زیادہ اُس کے خاندان پر اثرانداز ہوتی ہے، وہ بھی کسی طور چھپائے نہیں چھپتی تو آخر وہ غلطیاں اور کوتاہیاں جو سات کروڑ عوام کی معاشی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حالت میں خوفناک بگاڑ پیدا کر رہی ہوں، اُنھیں کس طرح چھپایا جاسکتا ہے۔ جو سربراہ یہ سمجھتا ہے کہ قوم سے تحریر وتقریر کی آزادی سلب کرکے یا اپنے مخالفین کے خلاف بے سروپا باتیں کہہ کر یا اُن پر اتہام باندھ کر یا کھوکھلے نعرے لگا کر، اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈال سکتا ہے تو وہ حقائق کی دُنیا میں سانس نہیں لیتا بلکہ جنت الحمقا میں بستا ہے۔ زبانِ خنجر کو تو ممکن ہے چپ رہنے پر مجبور کیا جاسکے، لیکن دُنیا کے کسی جابر کو آج تک یہ قوت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ آستین سے پکارنے والے لہو کی پکار پر کوئی پابندی عائد کرکے اُسے خاموش کردے۔ جب کسی فرد یا معاشرے پر ظلم ہو رہا ہو، انسانوں کو اُن کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جارہا ہو، ظلم واستبداد، غنڈہ گردی، بے انصافی اور زیردست آزاری

نے پورے ملک میں دہشت کی فضا پیدا کر دی ہے۔ اِن حالات میں اگر کوئی حکمران یہ سمجھتا ہے کہ محض خوش کُن نعروں اور لاف وگزاف کے زور پر وہ عوام کے دل جیت سکتا ہے تو وہ فریبِ نفس کے کسی شدید عارضہ میں مبتلا ہے جس کا مداوا اُس کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اِس میں کچھ شک نہیں کہ جب کوئی شخص اقتدار پر فائز ہوتا ہے تو اُس کے پرستاروں کی ثناخوانی اُس کے ضمیر کو خوابیدہ رکھتی ہے اور جو حکمران تنقید کی حوصلہ افزائی کر کے اپنے احتسابِ نفس کا اہتمام نہیں کرتا وہ اُمورِ مملکت چلانے میں، اپنے ساتھیوں کے انتخاب میں، اپنے دوستوں اور دُشمنوں کو پہچاننے میں بڑی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ وہ اپنے اِردگِرد مفاد پرستوں کی بھیڑ جمع کر لیتا ہے اور اُنہیں غلطی سے اپنے دمساز سمجھتا ہے درآنحالیکہ اُنہیں حکمران کی ذات سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ اُن کی ساری وابستگیاں اُن مفادات سے ہوتی ہیں جو وہ اقتدار کے توسط سے حاصل کرتے ہیں۔ اِس لیے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جو حکمران جتنا بڑا آمر ہوگا، اُسی نسبت سے گھٹیا قسم کے لوگ اُس کی طرف کھچے چلے آئیں گے۔ بھٹو صاحب اپنے مصاحبین کے حالات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں اُن میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اقتدار کے تحفظ میں ناجائز دولت کے انبار جمع نہیں کیے، جن کے دامن ناجائز الاٹمنٹوں کے الزامات سے پاک ہیں، جنہوں نے اپنے لیے اور اپنے متوسلین کے لیے ناجائز مراعات حاصل نہیں کیں۔ اِن وابستگانِ اقتدار کی انسانیت سوز کارروائیوں کی اگر صحیح تصویر عوام کے سامنے آجائے اور انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اُن کی قومی دولت کو اِن لوگوں نے کس بے دردی کے ساتھ لوٹا ہے اور ذاتی مفادات کی خاطر مُلکی معیشت کو کس بے حسی کے ساتھ تباہ کیا ہے تو اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی لاوارث نعش کے ساتھ گِدھ اور کُتّے بھی وہ ظالمانہ سلوک نہیں کرتے جو اقتدار کے اِن پجاریوں نے بھٹو صاحب کے سایۂ عاطفت میں ملکی دولت کے ساتھ کیا ہے۔ ہماری عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ "قائدِ عوام" کے حاشیہ نشینوں نے اِس ضمن میں جو کچھ کیا وہ اُس سے بے خبر تھے۔ وہ یقیناً اُن کی ہر حرکت سے پوری طرح واقف تھے، لیکن انہوں نے اُن کی ساری بداعمالیوں کو نہ صرف بخوشی گوارا کیا، بلکہ انہیں تحفظ دینا بھی ضروری سمجھا کیونکہ اُن کی آمریت کے قیام کا (باقی برصفحہ ۴۸)

باب ۱۲

مکّی دَور کے آخری تین سال

(۲)

مُصْعَبؓ بن عُمیر کا مدینہ بھیجا جانا ابن جَریر اور ابن ہِشام نے محمد بن اسحاق سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب یہ لوگ مدینے واپس جانے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے ساتھ مُصْعَبؓ بن عُمیر کو بھیجا تاکہ ان کو قرآن کی تعلیم دیں، اسلام سکھائیں، اور اُن کے اندر دین کی سمجھ پیدا کریں۔ چنانچہ مدینے جاکر حضرت مصعبؓ اسعدؓ بن زُرارہ کے ہاں ٹھیر گئے۔

اس کے برعکس موسیٰ بن عُقبہ کی روایت یہ ہے کہ ان لوگوں نے مدینے جانے کے بعد مُعاذؓ بن عفرا اور رافع بن مالک کو اِس غرض کے لیے حضورؐ کے پاس بھیجا تھا کہ آپ کسی ایسے شخص کو بھیج دیں جو ہمیں دین سکھائے، اور اِس درخواست پر آپؐ نے حضرت مصعبؓ کو روانہ کیا تھا۔ اس سے ذرا مختلف بَیہقی کی ابن اسحٰق سے یہ روایت ہے کہ ان لوگوں نے حضورؐ کو لکھا کہ ہمیں دین کی تعلیم دینے کے لیے کسی کو بھیج دیجیے، اِس پر مصعبؓ بن عمیر بھیجے گئے۔ واقدی سے ابن سعد کی روایت بھی یہی ہے۔

اِس دوسری بیعت عَقَبہ کے بعد واپس جاکر انصار کے لوگوں نے حضرت مصعبؓ بن عُمیر کی قیادت میں بڑی تیزی کے ساتھ اسلام پھیلانا شروع کیا۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بنی عبدُالاَشہَل میں سے عَبّادؓ بن بِشر بن وَقش اور ان کے حلفاء میں سے محمد بن مَسلمؓ نے حضرت مصعبؓ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد بنی عبدُالاَشہَل کے سردار سعد بن مُعاذ اور اُسید بن حُضیر ایک ہی دن اُن کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور ان کے اسلام قبول کرتے ہی ان کا پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا، حتّٰی کہ بنی عبدُالاَشہَل کے محلّے میں ایک بھی غیر مسلم نہ رہا۔ ابن اسحاق سے ابن ہِشام اور طبَری نے

حضرت سعدؓ اور حضرت اُسیدؓ کے مسلمان ہونے کا بہت دلچسپ قصہ نقل کیا ہے:

ایک روز حضرت اسعدؓ بن زُرارہ حضرت مصعبؓ کو ساتھ لے کر بنی ظفر (قبیلۂ اوس کی ایک شاخ) کے باغوں میں سے ایک باغ میں گئے، اور وہاں وہ متعدد اصحاب جمع ہو گئے جو مسلمان ہو چکے تھے۔ اِس کی اطلاع جب سَعْد بن مُعاذ اور اُسَید بن حُضَیر کو پہنچی تو سعد نے اُسید سے کہا کہ "ذرا اِن دونوں آدمیوں (یعنی اسعدؓ اور مُصعبؓ) کے پاس جاؤ جو ہماری بستیوں میں آکر ہمارے کمزور لوگوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں اور ان کو ڈانٹ کر ہمارے علاقے میں آنے سے منع کر دو۔ اگر اسعدؓ بن زُرارہ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں خود جاتا، مگر تم جانتے ہو کہ وہ میرا خالہ زاد بھائی ہے اور میں اس کا سامنا کرنے سے بچنا چاہتا ہوں"۔ اس پر اُسید اپنا حربہ لیے ہوئے وہاں پہنچے۔ اسعدؓ نے ان کو آتے دیکھ کر مُصعبؓ سے کہا "یہ اپنی قوم کا سردار آ رہا ہے۔ اِس کے سامنے ٹھیک ٹھیک اللہ کی بات پہنچانے کا حق ادا کر دو"۔ حضرت مُصعبؓ نے کہا اگر یہ بیٹھ گئے تو میں بات کروں گا۔ اُسید اُن کے سامنے آکر بڑے درشت انداز میں کھڑے ہو گئے اور بولے "کیا چیز تم دونوں کو یہاں لائی؟ تم ہمارے کمزور لوگوں کو بیوقوف بناتے ہو۔ اگر اپنی جان کی خیر چاہتے ہو تو ادھر کا رُخ نہ کرنا"۔ مصعبؓ نے کہا "کیا آپ بیٹھ کر ہماری بات نہ سُنیں گے؟ اگر پسند آئے تو قبول کر لیجیے۔ نہ پسند آئے تو جو کام آپ کو ناپسند ہو گا وہ نہ کیا جائے گا"۔ اُسید نے کہا یہ تم نے انصاف کی بات کی، اور اپنا حربہ زمین میں گاڑ کر اُن کے پاس آ بیٹھے۔ حضرت مصعبؓ نے ان کو اسلام کی تعلیمات بتائیں اور قرآن پڑھ کر سُنایا۔ حضرت اسعدؓ اور حضرت مصعبؓ، دونوں کا بیان ہے کہ خدا کی قسم، اُسید کے چہرے کی بشاشت اور اُن کے اندازِ کلام کی نرمی دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ اسلام اِن کے اندر اُتر گیا ہے۔ پوری بات سُننے کے بعد اُنہوں نے کہا "کیسا عمدہ اور حسین کلام ہے یہ۔ تم لوگ جب اس دین میں داخل ہوتے ہو تو کیا کرتے ہو؟" دونوں صاحبوں نے کہا "غسل کر کے اپنے جسم کو پاک کر لیجیے، اور اپنے کپڑے بھی پاک کیجیے، پھر حق کی شہادت دیجیے، اور اس کے بعد نماز پڑھیے"۔ وہ اسی وقت اُٹھے، پاک صاف ہو کر آئے، کلمہ شہادت ادا کیا اور دو رکعت نماز پڑھ لی۔ پھر کہنے لگے کہ "میرے پیچھے ایک آدمی ہے جو اگر تمہاری پیروی اختیار کر لے تو اُس کی قوم میں سے ایک آدمی بھی اس کے خلاف نہ چلے گا۔ میں جا کر اُسے تمہارے پاس بھیجتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اُسید رضی اللہ عنہ اپنا حربہ لے کر سعد بن مُعاذ

کی طرف چلے جن کے پاس اُن کی قوم (یعنی قبیلے) کے لوگ مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سعد نے ان کو آتے دیکھ کر کہا" میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ یہ وہ چہرہ نہیں ہے جیسے لیے ہوئے اُسیدؓ گئے تھے"۔

حضرت اُسیدؓ جب آ کر مجلس کے سامنے کھڑے ہوئے تو سعد نے پوچھا کیا کر آئے؟ انہوں نے کہا" میں نے دونوں آدمیوں سے بات کی، مجھے تو اُن میں کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ میں نے ان کو منع کیا تو انہوں نے جواب دیا جو کچھ آپ چاہتے ہیں ہم وہی کریں گے"۔ پھر حضرت اُسیدؓ نے کہا" میں نے سُنا ہے کہ بنی حارثہ اسعدؓ بن زرارہ کو قتل کرنے کے لیے نکلے ہیں، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسعد تمہارا خالہ زاد بھائی ہے اور وہ تمہاری تذلیل کرنا چاہتے ہیں"۔ یہ سُنتے ہی سعد غصّے میں فوراً اُٹھے اور اپنا حربہ لے کر تیزی سے چلے تاکہ بنی حارثہ کا ہاتھ پڑنے سے پہلے اپنے بھائی تک پہنچ جائیں۔ چلتے ہوئے انہوں نے اُسیدؓ سے کہا" واللہ، میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے بھیجنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا"۔ حضرت اسعدؓ نے دُور سے اُن کو آتے دیکھ کر حضرت مصعبؓ سے کہا یہ ایسا سردار ہے جس کے پیچھے اس کی ساری قوم ہے۔ یہ مسلمان ہوگیا تو کوئی دو آدمی بھی ایسے نہ رہیں گے جو اس کی قوم میں سے اسلام قبول نہ کرلیں۔ وہاں پہنچ کر جب سعد نے دیکھا کہ اسعدؓ اور مصعبؓ، دونوں اطمینان سے بیٹھے ہیں تو سمجھ گئے کہ اُسیدؓ کا مقصد دراصل مجھے اِن کی بات سُنوانا تھا۔ وہ غضبناک انداز میں آ کر کھڑے ہوئے اور اسعدؓ بن زرارہ سے کہا" ابو اُمامہ، بخدا اگر میرے اور تمہارے درمیان قرابت نہ ہوتی تو یہ شخص (یعنی حضرت مُصعبؓ) مجھ سے نہ بچ سکتا تھا۔ کیا تو ہمارے گھر میں ہم پر اس چیز کو مسلط کرنا چاہتا ہے جو ہمیں پسند نہیں ہے؟ حضرت مصعبؓ نے کہا" کیا آپ بیٹھ کر ہماری بات نہ سُنیں گے؟ پسند آئے تو قبول کرلیجیے۔ پسند نہ آئے تو ہم آپ سے اُس چیز کو دُور رکھیں گے جو آپ کو پسند نہیں ہے"۔ سعد نے کہا یہ تم نے انصاف کی بات کہی۔ پھر اپنا حربہ انہوں نے زمین میں گاڑ دیا اور بیٹھ گئے۔ حضرت مصعبؓ نے اُن کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن پڑھ کر سُنایا۔ حضرت اسعدؓ اور حضرت مصعبؓ کا بیان ہے کہ ان کے بولنے سے پہلے ہی ہم ان کے چہرے کی بشاشت اور نرمی دیکھ کر سمجھ گئے کہ اسلام ان پر اثر کر گیا ہے۔ سعد نے ساری بات سننے کے بعد کہا، اس دین میں داخل ہونے کے لیے تم لوگ کیا کرتے ہو؟ انہوں نے وہی بات ان سے بھی کہی جو حضرت اُسیدؓ سے کہی تھی، اور وہ پاک صاف ہو کر آئے، کلمۂ شہادت ادا کیا، دو رکعتیں

پڑھیں، اور اپنا حربہ لیے ہوئے اپنے قبیلے کی مجلس کی طرف پلٹ گئے۔

حضرت سعدؓ جب لوگوں کے سامنے پہنچے تو انہیں آتے دیکھ کر ہی لوگ بول اٹھے کہ یہ وہ چہرہ نہیں ہے جسے لیے ہوئے سعدؓ گئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا "اے بنی عبدالاشہل، تم اپنے درمیان میرے بارے میں کیا جانتے ہو؟" سب نے کہا "ہمارے سردار، ہم میں سب سے زیادہ صلۂ رحمی کرنے والے، ہم میں سب سے بڑھ کر صائب الرائے، اور ہم میں سب سے زیادہ عمدہ عقل اور تجربہ رکھنے والے۔" حضرت سعدؓ یہ جواب سن کر بولے "تمہارے مردوں اور تمہاری عورتوں سے بات کرنا مجھ پہ حرام ہے جب تک تم اللہ اور اس کے رسول پہ ایمان نہ لے آؤ۔" اس کے بعد شام ہونے سے پہلے بنی عبدالاشہل کے سب مرد و عورت مسلمان ہو گئے۔ صرف ایک صاحب اُصَیرِم عمرو بن ثابت رہ گئے تھے، تو وہ عین غزوۂ اُحد کے موقع پہ ایمان لائے، اور ایک سجدے کی نوبت آنے سے پہلے ہی شہید ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا وہ جنتی ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بنی عبدالاشہل میں ایک شخص بھی منافق نہ تھا۔ واقدی کے حوالہ سے ابن سعد نے لکھا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ اور اُسید بن حُضیر بنی عبدالاشہل کے بت توڑتے پھرتے تھے۔

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضرت مُصعبؓ مدینے میں پیہم تبلیغ کرتے رہے، یہاں تک کہ انصار کے محلوں میں سے کوئی محلہ ایسا نہ رہا جس میں مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں موجود نہ ہوں۔ صرف تین چار گھرانے ایسے رہ گئے جنہوں نے غزوۂ خندق تک اسلام قبول نہ کیا۔

مدینے میں جمعہ کا قیام | حضرت کعبؓ بن مالک اور ابن سیرینؒ کی روایت ہے کہ نمازِ جمعہ کا حکم آنے سے پہلے ہی مدینے کے انصار نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن اجتماعی نماز پڑھیں گے اور اس غرض کے لیے انہوں نے یہودیوں کے سبت اور عیسائیوں کے اتوار کو چھوڑ کر جمعہ کا دن اختیار کیا تھا (جسے جاہلیت کے زمانے میں یوم عَرُوبہ کہا جاتا تھا)۔ سب سے پہلا جمعہ حضرت اسعدؓ بن زرارہ نے بنی بیاضہ کے علاقہ میں پڑھایا جس میں ۴۰ آدمی شریک تھے (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان، عبد بن حمید، عبدالرزاق، بیہقی، ابن ہشام)۔

دارقطنی نے حضرت عبداللہؓ بن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ مکہ معظمہ میں جب نماز جمعہ کا

حکم آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مُصعبؓ بن عُمیر کو مدینے تحریری حکم بھیجا کہ زوال کے بعد لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھاؤ۔ مدینے میں اقامتِ جمعہ کا حکم بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت مکّہ معظمہ میں جمعہ کی نماز پڑھنا ممکن نہ تھا۔

آخری بیعتِ عَقَبہ

ذی الحجہ ۱۳ھ بعدِ بعثت (جون یا آغازِ جولائی ۶۲۲ء) کا زمانہ حج آنے تک مدینے میں اسلام خوب پھیل چکا تھا۔ امام احمد اور طبرانی نے حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ سال تک عُکاظ اور مَجَنّہ کے میلوں میں اور حج کے موقع پر، قبائل کی قیام گاہوں کے چکر کاٹتے رہے اور فرماتے رہے کہ کون مجھے اپنے ہاں پناہ دیتا ہے، اور کون میری مدد کرتا ہے تاکہ میں اپنے رب کا پیغام پہنچاؤں اور اسے اس کے بدلے میں جنت ملے؟ مگر کوئی آپ کی حمایت کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ بلکہ اگر یمن یا مُضَر کا کوئی آدمی مکّے جانے کے لیے نکلتا تو اُس کی قوم کے لوگ اور اس کے رشتہ دار اس سے کہتے کہ ذرا قریش کے اُس جوان سے بچے رہنا، کہیں وہ تمہیں فتنے میں نہ ڈال دے۔ حضورؐ لوگوں کی قیام گاہوں کے پاس سے گزرتے تو آپ کے اوپر انگلیاں اُٹھائی جاتیں۔ آخر کار اللہ نے ہمیں یَثرِب سے آپؐ کے پاس بھیج دیا اور ہم نے آپ کی تصدیق کی اور حال یہ ہو گیا کہ ایک آدمی گھر سے نکلتا، ایمان لاتا، قرآن پڑھتا اور پلٹ کر جب اپنے گھر جاتا تو اُس کے گھر والے بھی مسلمان ہو جاتے۔ اس طرح انصار کے محلّوں[1] میں سے کوئی ایسا نہ رہا جس میں مسلمانوں کا ایک گروہ نہ پایا جاتا ہو، اور وہ علی الاعلان اپنے اسلام کا اظہار نہ کرتا ہو۔ ایک روز ہم سب جمع ہوئے اور آپس میں بات کی کہ آخر ہم کب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں چھوڑے رکھیں گے کہ آپؐ مکّے کے پہاڑوں میں جگہ جگہ پھر رہے ہیں، ہر جگہ سے آپ کو ردّ کیا جا رہا ہے اور کہیں

---

[1] اصل میں لفظ دُوْر استعمال ہوا ہے جو دار کی جمع ہے۔ اہل مدینہ کی بستی اس طرز پر تھی کہ ہر قبیلے کا الگ دار تھا جس میں اُس کے مکانات، کھیت، نخلستان، سب یکجا ہوتے تھے۔ اس طرح کے ۹ دار اُس زمانے میں مدینے کے اندر پائے جاتے تھے، اور ہر ایک دار اپنی جگہ مستقل بھی تھا اور دوسرے قبیلوں کے داروں سے متصل بھی۔ اسی بنا پر ہم نے دار کے لیے لفظ محلّہ استعمال کیا ہے۔

آپ کو امن میسّر نہیں ؟ اس کے بعد ہم ۷۰ آدمی حج کے موقع پر گئے اور حضورؐ سے عقبہ میں ملاقات کا وقت طے ہوا۔ (اس حدیث کا بقیہ حصہ ہم آگے چل کر درج کریں گے)۔

امام احمد، طبرانی، ابن جریر طبری اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے حضرت کعبؓ بن مالک کی روایت نقل کی ہے کہ ہم اپنی قوم کے مشرکین[1] کے ساتھ حج کے لیے نکلے۔ ہمارے ساتھ ہمارے سردار اور بزرگ براء بن مَعرُور بھی تھے۔ راستے میں انہوں نے کہا میری ایک رائے ہے، معلوم نہیں تم لوگ اس سے اتفاق کرتے ہو یا اختلاف۔ ہم نے پوچھا وہ کیا ہے؟ کہنے لگے میری رائے یہ ہے کہ میں کعبہ کی طرف پیٹھ کر کے نماز نہ پڑھوں بلکہ اُس کی طرف منہ کر کے پڑھوں۔ ہم نے کہا کہ ہمیں تو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ شام (یعنی بیت المقدس) کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ہم آپؐ کے طریقے کے خلاف عمل نہ کریں گے۔ مگر وہ کعبہ ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے اور ہم انہیں اس پر ملامت کرتے رہے۔ مکے پہنچے تو انہوں نے مجھ سے کہا بھتیجے، چلو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کریں اور ان سے اپنے اِس فعل کے متعلق پوچھیں جو میں کرتا رہا ہوں، کیونکہ تم لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے میرے دل میں کھٹک پیدا ہو گئی ہے۔ ہم نے حضورؐ کو کبھی دیکھا نہ تھا، آپ کو پہچانتے نہ تھے، اس لیے اہلِ مکہ میں سے ایک شخص سے ہم نے آپؐ کا پتہ پوچھا۔ اُس نے کہا ان کے چچا عباس کو جانتے ہو؟ ہم نے کہا ہاں، کیونکہ وہ تجارت کے سلسلے میں ہمارے ہاں آتے رہتے تھے۔ وہ بولا حرم میں جاؤ، وہ عباس کے ساتھ بیٹھے نظر آئیں گے۔ ہم جب وہاں پہنچے تو ہم نے آپؐ کو سلام کیا۔ آپؐ نے عباس سے پوچھا، آپ اِن دونوں کو جانتے ہیں؟ انہوں نے کہا ہاں، یہ براء بن معرور ہیں اور یہ کعبؓ بن مالک۔ میں حضورؐ کا یہ قول کبھی نہیں بھولتا کہ میرا نام سن کر آپ نے فرمایا "شاعر؟" عباس نے کہا ہاں۔ پھر براء نے اپنا مسئلہ پوچھا اور حضورؐ کی ہدایت کے مطابق انہوں نے اُسی قبلہ کی طرف نماز پڑھنی شروع کر دی جس کی طرف حضورؐ پڑھتے تھے۔ اس کے بعد حضورؐ نے ہمیں ہدایت فرمائی کہ ہم ایامِ تشریق[2] کے بیچ والے روز عقبہ میں

---

[1] حاکم اور ابن سعد کی روایت ہے کہ اُس سال اَوس و خزرج کے ۵۰۰ آدمی حج کے لیے نکلے تھے۔

[2] ایامِ تشریق سے مراد وہ دن ہیں جن میں حج کے بعد لوگ منیٰ میں ٹھیرتے ہیں۔

آپؐ سے رات کے وقت ملیں۔ جب وہ رات آئی تو ہم اپنی قوم کے ساتھ اپنے پڑاؤ پر سوئے اور ایک تہائی رات گذرنے کے بعد خفیہ طور پر آپؐ سے ملنے کے لیے چلے، کیونکہ ہم اپنی قوم کے مشرکین سے یہ معاملہ چھپانا چاہتے تھے۔ لیکن ہمارے ساتھ ہمارے سرداروں اور اشراف میں سے ابوجابر عبداللہ بن عَمْرو بن حَرام تھے جو ابھی تک اپنے دین پہ قائم تھے۔ ان کو ہم نے ساتھ لے لیا اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے اشراف اور سرداروں میں سے ہیں، ہم نہیں چاہتے کہ آپ جہنم کا ایندھن بنیں۔ پھر ہم نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور ان کو بتایا کہ اِس وقت ہمیں عَقَبَہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنا ہے۔ انہوں نے اُسی وقت اسلام قبول کر لیا اور ہمارے ساتھ بیعتِ عقبہ میں شریک ہوئے۔ اُس وقت ہم ۷۳ مرد تھے اور ہمارے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ ایک بنی نَجّار میں سے نَسِیبَہ یا نُسَیبَہ بنت کعب[1] اُمِّ عُمارَہ، دوسری بنی سَلِمَہ میں سے اسماء بنت عمرو اُمِّ مَنیع۔

[اِس بیعت کے شرکاء کی تعداد حضرت جابرؓ نے ۷۰ بتائی ہے اور عورتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ یہی قول امام احمد اور بیہقی نے عامر شَعْبیؒ سے نقل کیا ہے۔ لیکن حضرت کعبؓ بن مالک نے ۷۳ مردوں اور دو عورتوں کا ذکر کیا ہے، اور ان کے ناموں کی بھی صراحت کی ہے۔ ابن اسحاق نے مزید تفصیل یہ دی ہے کہ ۷۳ مرد تھے جن میں ۱۱ اوس میں سے تھے اور ۶۲ خزرج میں سے۔ اور دو عورتیں تھیں۔ ایک نُسَیبہؓ بنت کعب جو اپنے شوہر زیدؓ بن عاصم، اور اپنے دو لڑکوں حبیبؓ اور عبداللہ

---

[1] یہ خاتون مُسَیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کے ساتھ تھیں۔ لڑائی میں بذاتِ خود حصہ لیا۔ ۱۲ زخم کھائے اور ایک ہاتھ کٹ گیا۔ اس سے پہلے اُن کے صاحبزادے حبیبؓ کو مسیلمہ ایک ایک عضو کاٹ کر ہلاک کر چکا تھا۔ جب وہ کہتا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رسول ہونے کی شہادت دیتے ہو؟ تو یہ کہتے ہاں۔ جب وہ کہتا کہ تم میرے رسول ہونے کی شہادت دیتے ہو تو یہ کہتے میں کچھ نہیں سنتا۔ اس پر وہ ان کا ایک عضو کاٹ دیتا۔ اسی طرح ہر سوال و جواب کے بعد ان کا ایک ایک عضو کاٹا جاتا رہا، حتیٰ کہ اُس ظالم نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے مار ڈالا، مگر انہوں نے اُس جھوٹے مدعی رسالت کی آخر وقت تک تصدیق نہ کی (ابن ہشام۔ جلد دوم، صفحہ ۱۰۸-۱۰۹)۔

کے ساتھ آئی تھیں - اور دوسری اسماء بنت عمرو - غالباً اِس اختلافِ روایات کی وجہ یہ ہے کہ عرب اکثر کسر چھوڑ کر عدد بیان کرتے ہیں، اور جماعت کی عظیم اکثریت اگر مردوں پر مشتمل ہو تو انہی کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، اور اکّا دُکّا عورت کا ذکر نظر انداز کر جاتے ہیں -]

ابن سعد نے واقدی کے حوالہ سے عُوَیمؓ بن ساعدہ کی روایت نقل کی ہے کہ جب ہم مکہ پہنچے تو سعدؓ بن خیثمہ اور مَعنؓ بن عَدی اور عبد اللہؓ بن جُبَیر نے مجھ سے کہا کہ چلو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملیں اور آپ کو سلام کریں، کیونکہ ہم آپؐ پر ایمان تو لا چکے ہیں مگر ابھی تک آپؐ کو دیکھا نہیں ہے - چنانچہ ہم نکلے اور ہمیں بتایا گیا کہ آپ عباس بن عبد المطلب کے مکان پر تشریف رکھتے ہیں - ہم وہاں پہنچے، آپ کو سلام کیا اور آپ سے پوچھا کہ ہماری (یعنی مدینے سے آنے والے وفد کی) ملاقات آپ سے کب اور کہاں ہو؟ حضرت عباسؓ نے کہا تمہارے ساتھ تمہاری قوم کے وہ لوگ بھی ہیں جو تمہارے مخالف ہیں، اس لیے اپنا معاملہ مخفی رکھو یہاں تک کہ حاجی منتشر ہو جائیں - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاقات کے لیے وہ رات تجویز کی جس کی صبح کو یومُ النَّفرِ الآخِر کہا جاتا ہے (یعنی وہ آخری دن جب حاجی منیٰ سے روانہ ہو جاتے ہیں) - مقام، عقبہ کا نشیبی حصہ مقرر فرمایا[1]، اور حکم دیا کہ کسی سونے کو جگانا نہیں اور کسی غائب کا انتظار نہ کرنا -

بیعتِ عَقَبہ کے بارے میں تمام روایات اِس بات پر متفق ہیں کہ جب یہ لوگ رات کے وقت چھپتے چھپاتے، دو دو چار چار کر کے طے شدہ مقام پر پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عباس بن عبد المطلب کے ساتھ موجود پایا - حضورؐ اپنے معاملات میں اُن پر اعتماد فرماتے

---

[1] ابن سعد نے لکھا ہے کہ یہ وہ جگہ تھی جہاں اب مسجد بنی ہوئی ہے - (طبقات ابن سعد، طبع بیروت، ۱۹۵۷ء، جلد اوّل، ص ۲۲۱) - ابن سعد ۱۶۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۳۰ھ میں وفات پائی - اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مقام پر دوسری صدی ہجری میں مسجد موجود تھی - اور یہ مسجد اُس وقت بھی موجود تھی جب ۱۹۳۶ء میں محمد حسین ہَیکل نے حجاز کا سفر کیا، جیسا کہ وہ اپنی کتاب فی منزل الوحی میں مسجد العقبہ کے نام سے صفحہ ۱۱۱ پر بیان کرتے ہیں - مگر افسوس کہ آج اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں پایا جاتا -

تھے، حالانکہ ابھی وہ بظاہر غیر مسلم بنے ہوئے تھے۔[1] وہ اس لیے اس نازک موقع پر آئے تھے کہ حضورؐ کے مدینہ جانے سے پہلے ہر لحاظ سے بات پختہ کرلیں۔

امام احمدؒ، بیہقی اور عامر شعبی کی روایت ہے کہ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضورؐ نے فرمایا کہ جس کو بولنا ہو مختصر بولے اور بات کو طول نہ دے، کیونکہ مشرکین کے جاسوس تمہاری کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔ حضرت کعبؓ بن مالک، جن کی روایت کا ایک حصہ ہم امام احمدؒ، ابن جریر طبری اور ابن ہشام کے حوالہ سے اوپر نقل کر چکے ہیں، اپنی اُسی روایت کے سلسلہ میں آگے چل کر بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت عباس نے گفتگو کی ابتداء کی۔ انھوں نے کہا، "خزرج[2] کے لوگو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے ہاں جو حیثیت رکھتے ہیں وہ تمہیں معلوم ہے۔ جو لوگ ان کے بارے میں ہمارے ہم خیال ہیں (یعنی جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا ہے) اُن کے مقابلے میں ہم (یعنی بنی ہاشم و بنی مُطّلب) نے ان کی حمایت و حفاظت کی ہے، اس لیے یہ اپنی قوم کے اندر مضبوط حیثیت اور اپنے شہر میں محفوظ مقام رکھتے ہیں۔ لیکن یہ تمہارے ہاں جانے کے سوا اور کسی بات پر راضی نہیں ہیں۔ اب اگر تم لوگ سمجھتے ہو کہ تم اُس عہد و پیمان کو پورا کرو گے جس کے ساتھ تم انھیں مدعو کر رہے ہو اور ان کے مخالفین کے مقابلے میں ان کی حفاظت کرو گے، تو جو ذمہ داری تم اپنے اُوپر اُٹھا رہے ہو اُسے اُٹھا لو۔ لیکن اگر یہاں سے ان کے نکلنے اور تمہارے ساتھ جا ملنے کے بعد تم کسی درجہ میں بھی یہ اندیشہ رکھتے ہو کہ تمہیں ان کا ساتھ چھوڑ دینا اور انھیں دشمنوں کے حوالے کر دینا پڑے گا تو بہتر یہی ہے کہ ابھی سے ان کو چھوڑ دو، کیونکہ یہ اپنی قوم میں مضبوط حیثیت اور اپنے شہر میں محفوظ مقام رکھتے ہیں"۔ ہم نے کہا "آپ کی بات ہم نے سن لی۔ اب یا رسول اللہ، آپ ارشاد فرمائیں اور اپنے لیے جو عہد

---

[1] ابن سعد نے ابو رافعؓ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت عباس کا غلام تھا اور اسلام ہمارے گھر میں داخل ہو چکا تھا۔ حضرت عباسؓ، ان کی بیوی اُمّ الفضلؓ اور میں، سب مسلمان ہو چکے تھے، مگر حضرت عباس اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے۔ جنگِ بدر کے بعد جب کفار کے ہاں گھر گھر ماتم برپا تھا، ہمارے ہاں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔

[2] اُس زمانے میں اَوس اور خزرج کے مجموعے کو خزرج کہا جاتا تھا۔

ہم سے لینا چاہیں، لے لیں"۔ اس پر حضورؐ نے اپنی تقریر میں قرآن پڑھا، اللہ کی طرف دعوت دی، اسلام کی طرف رغبت دلائی، اور اس کے بعد فرمایا "میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم میری اسی طرح حمایت و حفاظت کرو گے جس طرح خود اپنے بال بچوں کی کرتے ہو"۔ براءؓ بن معرور نے حضورؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر عرض کیا، "جی ہاں۔ اس خدا کی قسم جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، ہم آپؐ کی ہر اس چیز سے حفاظت کریں گے جس سے ہم خود اپنی جان اور اپنی آل اولاد کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس یا رسول اللہ، ہم سے بیعت لیجیے، ہم جنگ آزما لوگ ہیں، ہم نے اپنے باپ دادا سے اس کو وراثت میں پایا ہے"۔ بیچ میں بات کاٹ کر ابوالہیثم بن التَّیِّہان[1] نے کہا، "یا رسول اللہ، ہمارے اور دوسرے لوگوں (یعنی یہود) کے درمیان حلیفانہ تعلقات ہیں جن کو اب ہم کاٹ دینے والے ہیں۔ اس کے بعد کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ آپؐ کو غلبہ عطا کر دے تو آپؐ ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم (یعنی قبیلے) میں واپس تشریف لے جائیں"؟ حضورؐ نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں، بلکہ اب خون کے ساتھ خون اور قبر کے ساتھ قبر ہے (یعنی میرا مرنا اور جینا اب تمہارے ساتھ ہے)، میں تمہارا ہوں اور تم میرے ہو، جس سے تمہاری لڑائی اس سے میری لڑائی، اور جس سے تمہاری صلح اس سے میری صلح"۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری کی جو روایت ہم نے اس سے پہلے مسندِ احمد اور طبرانی سے نقل کی ہے اس میں آگے چل کر وہ فرماتے ہیں کہ عَقَبہ میں جب ہم سب جمع ہو گئے تو ہم نے عرض کیا، "یا رسول اللہ، ہم کس بات پر آپؐ سے بیعت کریں"؟ حضورؐ نے فرمایا، "اس بات پر کہ تم اچھے اور برے ہر حال میں حکم سنو گے اور اطاعت کرو گے، خوشحالی ہو یا بدحالی، ہر صورت میں مال خرچ کرو گے، نیکی کا حکم دو گے اور برائی سے منع کرو گے، اور اللہ کے معاملہ میں حق بات کہو گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرو گے۔ اور اس بات پر کہ جب میں تمہارے ہاں آؤں تو تم ہر اس چیز سے میری حفاظت کرو گے جس سے اپنی جانوں اور اپنے بال بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔ اس کے بدلے میں تمہارے لیے جنت ہے"۔ اس پر ہم اٹھ کر آپؐ کی طرف بڑھے

[1] بعض لوگوں نے اس کا تلفظ التَّیِّہان اور بعض نے التَّیْہان لکھا ہے۔

اور آپؐ کا ہاتھ جماعت کے سب سے کم سن نوجوان (بیہقی کی روایت میں الفاظ ہیں امیر سے سوا سب سے چھوٹے) اسعدؓ بن زُرارہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا: "ٹھیرو، اے اہلِ یثرب، ہم اپنے اُونٹ دوڑاتے ہوئے ان کے پاس اس کے سوا کسی اور وجہ سے نہیں آئے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، اور آج ان کو نکال کر اپنے ساتھ لے جانا تمام عرب کی دشمنی مول لینا ہے۔ اس کے نتیجے میں تمہارے نونہال قتل ہوں گے اور تلواریں تمہارا خون چاٹیں گی۔ لہٰذا اگر تم اس کو برداشت کرنے کی طاقت اپنے اندر پاتے ہو تو ان کا ہاتھ تھام لو، اور تمہارا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ لیکن اگر تمہیں اپنی جانوں کا خوف ہے تو پھر ابھی سے چھوڑ دو اور صاف صاف عذر کر دو، کیونکہ اس وقت عذر کر دینا اللہ کے ہاں زیادہ قابلِ قبول ہوگا۔" اس پر سب لوگوں نے کہا کہ "اسعد، ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ، خدا کی قسم ہم اس بیعت کو ہرگز نہ چھوڑیں گے اور نہ اس سے ہاتھ کھینچیں گے۔" اس کے بعد سب لوگوں نے بیعت کی۔ (حاکم اور بزّار اور بیہقی نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے)۔

ابن جریر طبری اور ابن ہشام نے عاصم بن عُمر بن قَتادہ کے حوالہ سے محمد بن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ بیعت کے موقع پر عباسؓ بن عُبادہ بن نَضلَہ انصاری نے کہا "خزرج کے لوگو، کچھ جانتے ہو کہ اس ہستی سے تم کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟" آوازیں بلند ہوئیں کہ ہاں۔ عباسؓ نے بات پر زور دیتے ہوئے کہا "تم گورے اور کالے سب سے لڑنے کے لیے بیعت کر رہے ہو (یعنی یہ بیعت کر کے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لے رہے ہو)۔ اب اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ جب تمہارے مال تباہی کے، اور تمہارے اَشراف ہلاکت کے خطرے میں پڑ جائیں تو تم اسے دشمنوں کے حوالے کر دو گے، تو بہتر یہ ہے کہ آج ہی اسے چھوڑ دو، کیونکہ خدا کی قسم یہ دُنیا اور آخرت کی رسوائی ہوگی۔ اور اگر تم سمجھتے ہو کہ جس عہد کے ساتھ تم اس ہستی کو اپنے ہاں دعوت دے رہے ہو اُسے اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اَشراف کی ہلاکت کے باوجود نباہ دو گے تو پھر بے شک اس کا ہاتھ تھام لو کہ خدا کی قسم یہ دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔" حاضرین نے بالاتفاق کہا کہ "ہم انہیں لے کر اپنے اموال کی تباہی اور اپنے اشراف کو ہلاکت کے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔" اس کے بعد لوگوں نے عرض کیا "یا رسولؐ اللہ، اگر ہم اپنے عہد کو پورا کر دکھائیں تو ہمارے لیے کیا ہے"؟ فرمایا "جنّت"۔

ابن اسعد نے حضرت مُعاذ بن رِفاعَہ بن رافِع کی روایت واقدی کے حوالہ سے نقل کی ہے کہ عقبہ کے مقام پر جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضورؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے گفتگو کا آغاز اِس طرح کیا: "اے گروہِ خزرج، تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ اور حال یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے درمیان سب سے بڑھ کر مضبوط حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم میں سے جنہوں نے اِن کا دین اختیار کیا ہے، اور جنہوں نے نہیں کیا، سب حَسَب اور شرف کی بنا پر اِن کی حفاظت کر رہے ہیں۔ مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سب کو چھوڑ کر تمہارے پاس ہی جانا چاہتے ہیں۔ اب تم دیکھ لو کہ تم اتنی طاقت اور استقامت اور جنگی بصیرت رکھتے ہو یا نہیں کہ تمام عرب کی عداوت کے مقابلے میں ڈٹ سکو۔ کیونکہ عرب متحد ہو کر تم پر پل پڑیں گے۔ لہٰذا سوچ سمجھ کر رائے قائم کرو۔ آپس میں مشورہ کر لو۔ اور سب کے اتفاق سے کوئی ایک فیصلہ کرو۔ کیونکہ سب سے اچھی بات سچی بات ہے"۔ اِس کے بعد حضرت عباسؓ نے پوچھا: "ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اپنے دشمن سے لڑتے کس طرح ہو؟" لوگ خاموش رہے، اور (عبداللہؓ بن عَمرو بن حرام (جنہوں نے بیعت عقبہ سے عین پہلے اسلام قبول کیا تھا) نے اس سوال کا جواب دیا۔ انہوں نے کہا "واللہ، ہم جنگ آزما لوگ ہیں۔ لڑائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کے ہم مشّاق ہو چکے ہیں۔ باپ دادا سے ہم نے اس کو میراث میں پایا ہے۔ ہم پہلے تیر اندازی کرتے ہیں یہاں تک کہ تیر ختم ہو جائیں۔ پھر ہم نیزوں سے لڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ نیزے بھی ٹوٹ جائیں۔ پھر ہم تلواریں سونت کر بڑھتے ہیں اور شمشیر زنی کا مقابلہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہم میں سے یا ہمارے دشمنوں میں سے جس کی موت جلدی آجائے وہ مرجاتا ہے"۔ حضرت عباس نے کہا تم واقعی جنگی لوگ ہو۔ پھر بَراء بن مَعرور بولے "ہم نے آپ کی بات سن لی ہے۔ خدا کی قسم، اگر ہمارے دلوں میں کچھ اور ہوتا تو ہم صاف صاف کہہ دیتے۔ مگر ہم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سچی وفاداری کرنا اور آپ کے لیے اپنی جانیں لڑا دینا چاہتے ہیں۔ واقدی کی ایک اور روایت میں حضرت بَراءؓ بن معرور کی اس تقریر کے الفاظ بھی منقول ہوئے ہیں: "ہم خوب سامانِ جنگ اور لڑنے مرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ ہمارا یہ حال جب اُس وقت تھا جب ہم پتھر کے بُت پُوجتے تھے، تو بھلا ہمارا حال اب کیا ہوگا جب کہ اللہ نے ہمیں وہ حقیقت دکھا دی ہے جس سے دوسرے لوگ اندھے ہیں،

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہماری تائید فرمائی ہے"۔

بیعتِ عَقَبَہ کی اہمیت

اسلام کی تاریخ میں یہ ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بڑھا کر تھام لیا۔ اہلِ یثرب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں، بلکہ خدا کے نائب اور اپنے امام و فرمانروا کی حیثیت سے بلا رہے تھے اور اسلام کے پیروؤں کو اُن کا بلاوا اِس لیے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں، بلکہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خطوں میں جو مسلمان منتشر ہیں وہ یثرب میں جمع ہو کر اور یثربی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک منظّم اسلامی معاشرہ بنا لیں۔ اِس طرح یثرب نے دراصل اپنے آپ کو "مدینۃ الاسلام" کی حیثیت سے پیش کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول کر کے عرب میں پہلا دارالاسلام بنا لیا۔ اِس پیشکش کے معنی جو کچھ تھے اس سے اہلِ مدینہ ناواقف نہ تھے۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹا سا قصبہ اپنے آپ کو پورے ملک کی تلواروں اور معاشی و تمدنی بائیکاٹ کے مقابلہ میں پیش کر رہا ہے۔ چنانچہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر رات کی اُس مجلس میں اسلام کے اِن اوّلین مددگاروں (انصار) نے اس نتیجہ کو خوب اچھی طرح جان بوجھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا، جیسا کہ اس موقع پر اُن کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔

اَنصار کا جذبۂ فدائیت

تمام خطرات کو خوب جانتے اور سمجھتے ہوئے انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بیعت کی تھی اُس پر کسی قسم کی گھبراہٹ محسوس کرنا تو درکنار، انہیں تو اِس پر فخر تھا، اور ان کے اندر اِس راہ میں مُسابقت کا جذبہ اس قدر زبردست تھا کہ اُن میں یہ بحث چل پڑی کہ ہم میں سے کس کو بیعت کے وقت سب سے پہلے حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا شرف نصیب ہوا تھا؟ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ بنی النجّار کا دعویٰ تھا کہ اوّلین بیعت کرنے والے اسعدؓ بن زُرارہ تھے۔ بنی عبدالاَشہَل کا دعویٰ تھا کہ یہ شرف ابوالہَیثم بن التیّہان کو حاصل ہوا۔ ابن اثیر نے اُسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ بنی سَلِمہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے بیعت کرنے والے کعبؓ بن مالک تھے۔ ابن سعد نے واقدی کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اَوس اور خزرج میں اس بات پر تفاخر ہوا کہ بیعت میں سبقت کرنے والا اَوس میں سے تھا یا خزرج میں سے۔ آخر کار لوگوں نے

کہا کہ اس معاملہ کو حضرت عباس بن عبد المطلب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا، کیونکہ وہ اُس وقت حضورؐ کے ساتھ تھے۔ چنانچہ اُن سے پوچھا گیا۔ انھوں نے کہا حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والے پہلے شخص اسعدؓ بن زرارہ تھے، پھر براءؓ بن معرور، پھر اُسیدؓ بن حضیر۔

۱۲ نقیبوں کا تقرر

حضرت کعبؓ بن مالک کی جو روایت ہم اِس سے پہلے نقل کر چکے ہیں اس کے آخر میں وہ بیان کرتے ہیں کہ بیعت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا اپنے اندر سے مجھ کو ۱۲ نقیب منتخب کر کے دو جو اپنے اپنے قبیلے کے ذمہ دار ہوں (ابن اسحاق کی روایت طبقات ابن سعد میں یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: "جو اپنی قوم پر اُسی طرح کفیل ہوں جس طرح حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے حواری کفیل تھے"۔ دوسری روایت طبقات ابن سعد ہی میں واقدی سے یہ ہے کہ "موسیٰؑ نے بنی اسرائیل میں سے بارہ نقیب لیے تھے")۔ اِس ارشاد کے مطابق سب نے ۱۲ آدمی تجویز کیے، ۹ خزرج میں سے اور ۳ اوس میں سے۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ان کی فہرست حسبِ ذیل ہے:

خَزرج میں سے: ۱۔ اسعدؓ بن زُرارہ۔ (اِن کو حضورؐ نے نقیب النُّقَباء مقرر کیا)

۲۔ سَعْدؓ بن الرَّبیع۔ (زمانۂ جاہلیت میں اہلِ مدینہ کے چند پڑھے لکھے آدمیوں میں سے تھے)۔

۳۔ عبداللہؓ بن رَوَاحَہ۔ (یہ بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے)۔

۴۔ رافعؓ بن مالک (زمانۂ جاہلیت میں "کامل" کے نام سے یاد کیے جاتے تھے)۔

۵۔ بَراءؓ بن مَعرُور۔ (ہجرت سے کچھ پہلے ان کا انتقال ہو گیا اور حضورؐ نے ان کی قبر پر نمازِ جنازہ پڑھی)۔

۶۔ عبداللہؓ بن عَمرو بن حرام (یہ اُسی رات ایمان لائے تھے جس میں بیعتِ عقبہ ہوئی تھی)۔

۷۔ عُبادہؓ بن صامت

۸۔ سَعدؓ بن عُبادہ (زمانہ جاہلیت میں "کامل" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے)۔

۹۔ مُنذِرؓ بن عَمرو (یہ بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے)۔

اَوس میں سے: ۱۔ اُسَیدؓ بن حُضَیر (یہ بھی "کامل" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے)۔
۲۔ سَعدؓ بن خَیثمہ۔
۳۔ رِفاعہؓ بن عبدالمُنذِر (ابن ہشام نے لکھا ہے کہ اہل علم نے ان کی جگہ ابوالہیثم بن التیہان کا نام لکھا ہے)۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار سے فرمایا کہ اب تم لوگ اپنی اپنی قیام گاہوں کی طرف واپس چلے جاؤ۔

بیعت کی خبر پا کر قریش کا پہلا ردِ عمل

امام احمد، ابن جریر طَبری اور ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے حضرت کعبؓ بن مالک کی روایت نقل کی ہے، اور اس سے ملتی جلتی روایت واقدی نے متعدد سندوں سے بیان کی ہے جسے ابن سعدؒ نے طبقات میں نقل کیا ہے کہ جس رات بیعتِ عَقَبہ واقع ہوئی اسی رات قریش کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی، اور صبح اُن کے بڑے بڑے آدمی اہل مدینہ کی قیام گاہ پہ پہنچ گئے انہوں نے کہا کہ "اے گروہِ خزرج، ہمیں خبر ملی ہے کہ تم ہمارے اس آدمی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملے ہو اور تمہارا ارادہ اسے ہمارے ہاں سے نکال لے جانے کا ہے، اور تم اُس سے ہمارے خلاف جنگ کی بیعت کر رہے ہو۔ خدا کی قسم عرب میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس سے لڑنا ہمیں تمہارے خلاف جنگ کرنے سے زیادہ ناگوار ہو"۔ اس پہ اہل مدینہ میں سے جو لوگ مشرک تھے انہوں نے اٹھ کر بحلف کہا کہ "ایسا نہیں ہوا ہے اور ہمیں اس کا کوئی علم نہیں"۔ یہ بات کہنے میں وہ سچے بھی تھے، کیونکہ واقعی اُن کو اس کا علم نہیں تھا۔ لیکن مسلمان ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں دیکھتے رہے۔ پھر قریش کے سردار عبداللہ بن اُبَیّ کے پاس گئے اور اس سے اس معاملہ کا ذکر کیا۔ اس نے کہا "یہ اتنا بڑا کام ہے کہ میری قوم مجھ سے بالا بالا یہ نہیں کر سکتی، اور میں نہیں جانتا کہ ایسا ہوا ہے"۔

قریش کا ان جوابات سے اطمینان نہ ہوا۔ وہ برابر ٹوہ میں لگے رہے اور انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی یہ معاملہ ہوا ہے۔ چنانچہ حج سے اہل مدینہ کی واپسی کے وقت راستہ میں اُنہوں نے بیعت کرنے والوں کا پیچھا کیا اور مکہ سے باہر قریب ہی میں اَذاخِر کے مقام پہ حضرت سعدؓ بن عُبادہ اور مُنذِرؓ بن عَمرو کو جا لیا۔ مُنذِرؓ تو اُن سے بچ نکلے، مگر سعدؓ بن عبادہ پکڑے گئے۔ قریش کے لوگوں نے اُن کے ہاتھ گردن سے باندھ دیے اور اُن کو مارتے پیٹتے اور ان کے سر کے بال پکڑ کر

کھینچتے ہوئے مکے لے گئے۔

حضرت سعدؓ کا بیان ہے کہ جب مکے میں میرے ساتھ یہ کچھ ہو رہا تھا، ایک گورا چٹا، روشن چہرے والا، مردِ معقول سامنے آیا۔ (یہ شخص سُہیل بن عمروؓ تھا)۔ میں نے خیال کیا کہ اگر ان لوگوں میں کوئی خیر ہے تو وہ اِس شخص میں ہوگی۔ مگر جب وہ میرے قریب پہنچا تو اُس نے ایک زور کا گھونسا میرے رسید کیا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ واللہ ان میں کوئی خیر نہیں رہی۔ اِس حال میں کہ وہ لوگ مجھے گھسیٹ رہے تھے، اُن میں سے ایک شخص نے مجھ سے کہا (یہ ابوالبختری بن ہشام تھا) "بندۂ خدا، کیا تیرے اور قریش میں سے کسی کے درمیان کوئی عہد اور جوار (پناہ) کا کوئی تعلق نہیں ہے"؟ میں نے کہا کہ "میں اپنے علاقے میں جُبیر بن مُطعِم اور حارثِ بن حرب بن اُمیّہ بن عبدِشمس کے تجارتی قافلوں کو پناہ دیتا رہا ہوں"۔ (ابن سعد نے جُبیر کے بجائے اُس کے باپ مُطعِم بن عدی کا نام لکھا ہے)۔ اس نے کہا "تو اُن کا نام لے کر دُہائی دے اور بتا کہ تیرے اور ان کے درمیان کیا تعلق ہے"۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ شخص (یعنی ابوالبختری) اُن دونوں کو تلاش کرتا ہوا نکلا اور حرمِ کعبہ میں ان کو موجود پاکر کہا کہ خزرج کا ایک آدمی اَبطح (یعنی مکہ اور منیٰ کے درمیان مُحصَّب کی وادی) میں پیٹا جارہا ہے اور وہ تم دونوں کا نام لے کر پکار رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تمہارے اور اُس کے درمیان جوار کا تعلق ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ ہے کون؟ اُس نے کہا سعد بن عُبادہ۔ یہ سُن کر دونوں بول اُٹھے کہ خدا کی قسم وہ سچ کہتا ہے، ہمارے تاجروں کو وہ اپنے ہاں پناہ دیتا رہا ہے اور اس نے کسی کو ان پر ظلم نہیں کرنے دیا ہے۔ پھر وہ آئے اور انہوں نے حضرت سعدؓ کو ان ظالموں سے چھڑایا۔

واقدی کی روایت ہے کہ حضرت سعدؓ کے گم ہونے کا جب انصار کو علم ہوا تو وہ پلٹ کر ان کی تلاش میں چل پڑے۔ لیکن راستے ہی میں وہ اُن کو واپس آتے ہوئے مل گئے۔

بیعت کے بعد مدینے میں اشاعتِ اسلام مدینے واپس پہنچ کر انصار نے بہت تیزی سے اسلام پھیلانا شروع کردیا، اور بڑے زبردست دینی جوش کے ساتھ وہ بُت شکنی میں مشغول ہوگئے۔ ابن سعد نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ابوعَبسؓ بن جَبرؓ اور ابوبُردہؓ بن نیار بنی حارثہ کے بُت، عُمارہؓ بن حَزم، اسعدؓ بن زُرارہ، عوفؓ بن عفراء، سَلِیطؓ بن قیس اور ابوصِرمہ بنی نجّار کے بُت، معاذؓ بن جبل، ثعلبہؓ بن غَنمہ اور

عبداللہؓ بن اُنیس بنی سلمہ کے بت، زیادؓ بن لبید اور فروہؓ بن عمرو بنی بیاضہ کے بت، سعدؓ بن عبادہ، منذرؓ بن عمرو اور ابو دجانہؓ بنی ساعدہ کے بت توڑتے پھرتے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمان اُس وقت مشرکینِ مدینہ پر ایسے چھا گئے تھے کہ وہ اِس بت شکنی کی کوئی مزاحمت نہ کر سکتے تھے۔

اِس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ ابن ہشام نے لکھا ہے۔ اہل مدینہ کے سرداروں میں سے بنی سلمہ کے سردار، عمرو بن جموح اپنے شرک پر قائم تھے، حالانکہ اُن کے بیٹے معاذؓ بن عمرو مسلمان ہو کر عقبہ میں بیعت بھی کر آئے تھے۔ انھوں نے اپنی حویلی میں لکڑی کا ایک بت بڑی عزت و حرمت کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا جس کا نام مَنات تھا۔ اِس طرح کے بت کدے عام طور پر مشرکین کے سردار اپنی حویلیوں میں رکھا کرتے تھے۔ جب اُن کے قبیلے بنی سلمہ کے نوجوان، خود ان کے اپنے بیٹے سمیت مسلمان ہو گئے تو رات کو وہ اُن کے صنم خانے میں گھس جاتے اور اُس بت کو اوندھے منہ ایک گڑھے میں پھینک دیتے جس کے اندر محلّہ کے لوگ کوڑا کرکٹ ڈالا کرتے تھے۔ صبح اُٹھ کر جب عمرو اپنے بت کو غائب پاتے تو چیختے پیٹتے اُسے ڈھونڈنے نکلتے اور گڑھے میں جب وہ اوندھے منہ گرا ہوا ملتا تو اُسے نکال کر دھوتے، پاک صاف کر کے خوشبو لگا کر اس کی جگہ پر رکھ دیتے، اور کہتے کہ اگر مجھے وہ شخص مل جاتے جس نے تیرے ساتھ یہ حرکت کی ہے تو اس کو میں سخت رسوا کروں گا۔ یہ کھیل کئی روز چلتا رہا۔ ایک دن جب وہ اُس کو گڑھے سے نکال کر لائے تو ایک تلوار اس کی گردن میں لٹکا دی اور اس سے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تیرے ساتھ یہ حرکت کون کرتا ہے، اب اگر تیرے اندر کوئی خیر ہے تو اِس تلوار سے اپنی حفاظت کر۔ رات کو ان نوجوانوں نے وہ تلوار تو اُس کی گردن سے اُتار کر الگ رکھی، ایک مرا ہوا کتا اس کے ساتھ باندھا، اور رات ہی جا کر بنی سلمہ کے ایک کنویں میں پھینک دیا جس کے اندر گندگیاں ڈالی جاتی تھیں۔ صبح جب انھوں نے اسے غائب پایا تو ڈھونڈنے نکلے اور مرے ہوئے کتے کے ساتھ لوگوں کی گندگیوں میں اس کو اوندھا پڑا پایا۔ اِس وقت ان کی قوم کے مسلمانوں نے انھیں سمجھایا اور ان کی اپنی آنکھیں بھی کھل گئیں اور وہ سچے دل سے اسلام لے آئے۔ (باقی)

رُوداد ابتلاء: احمد رائف مصری

ترجمہ جناب خلیل الحامدی

(۲)

میجر محمد عبدالغفار ترک نے برآمدے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ ایک ایسے شخص نے کھولا جس نے غیر فوجی لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ بیوقوفی اور سنگدلی کی علامات صاف جھلک رہی تھیں۔ اُس نے میجر کو فوجی انداز میں سلام کیا اور ہمیں اندر آنے کی اجازت دے دی۔

یہ جگہ ایک تنگ کوٹھڑی سی تھی۔ جیسے جیل کی کوٹھڑی ہوتی ہے۔ جس دروازے سے ہم داخل ہوئے تھے اُس کے بالمقابل ایک اور دروازہ تھا جو بہت ہی چھوٹا تھا اور مقفل تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے دانشمندوں کا یہ مقولہ یاد آیا کہ لا تدخلوا من الباب الضیق (تنگ دروازے سے کبھی داخل نہ ہو)۔ میں اب اس تنگ وقت میں اس طرح کی حکمتوں اور فلسفوں پر کیا عملدرآمد کرسکتا ہوں۔ اندر ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی جس پر گہرے گلابی رنگ کی پالش کی ہوئی تھی۔ لکڑی کے اندر متعدد نام کھدے ہوئے تھے جنہیں میں پڑھ نہ سکا۔ اس میز پر دو یا تین رجسٹر پڑے تھے۔ اُسی طرح کے رجسٹر جو بالعموم تھانوں کے اندر ہوتے ہیں۔ میز کے ایک پہلو میں سبز رنگ کا لوہے کا ایک بہت بڑا سیف رکھا ہوا تھا جس کا دستہ چمکدار تانبے کا تھا۔ مجھے وہم ہوا کہ شاید مجھے اسی سیف کے اندر قیامت تک کے لیے بند کر دیں گے —— اے کاش وہ ایسا کر دیتے —— میز کے پیچھے ایک چھوٹی سی چارپائی رکھی تھی جس پر ایک قوی ہیکل انسان سویا ہوا زور زور سے خرّاٹے لے رہا تھا۔ وہ اس قدر لمبا تھا کہ اُس کی پنڈلیاں چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ ہمارے داخل ہونے کے باوجود وہ نیند سے نہ اُٹھا وہ یوں نظر آتا تھا جیسے کسی ٹھوس اور سرد چٹان کا کوئی ٹکڑا رکھا ہوا ہو۔ میز کے ساتھ ایک اور فوجی

افسر بیٹھا ہوا تھا جس نے اپنا کوٹ قریب والی کرسی پر لٹکا رکھا تھا اور اس کے کوٹ کے کندھوں پر تین ستارے اس بات کی علامت تھے کہ یہ کیپٹن کے عہدے کا افسر ہے۔ اس نے میجر ترک کا استقبال کیا اور وہ دونوں آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ اور میں گویا وہاں موجود ہی نہ تھا۔

میجر ترک اور اس کے ساتھی جلدی واپس چلے گئے۔ اور میں اب نئے فوجی افسر کی تحویل میں تھا۔ اور اس کے بالکل سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کسی توقف کے بغیر مجھ سے سوالات شروع کر دیے۔ پے درپے بڑی سرعت کے ساتھ۔ تمہارا نام کیا ہے۔ تمہاری عمر کیا ہے۔ تمہارا پیشہ کیا ہے۔ تمہارا پتہ کیا ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی چیز ایسی ہے جسے یہاں بطور امانت رکھنا چاہتے ہو۔ پیٹی اتار دو۔ عینک بھی اتار دو — میں نے اعتراض کیا کہ عینک تو میرے لیے بڑی ضروری ہے — اس وقت مجھے یہی محسوس ہوا کہ عینک میرے لیے بڑی ضروری ہے۔ وہ دیو ہیکل انسان جو چارپائی پر سو رہا تھا اور تھوڑی دیر پہلے بیدار ہو چکا تھا اس نے گرجتی ہوئی آواز سے کہا، تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ عینک اُتار دو۔

میں نے کہا، اس سے تمہارا کیا مطلب؟

وہ بولا: اس دروازے کے اندر جو چیز تمہارا انتظار کر رہی ہے تم اسے نہیں جانتے؟

یہ سن کر مجھ پر شدید مُردنی چھا گئی۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ عینک اس کے حوالے کر دی — کیا چیز میرا انتظار کر رہی ہے اور کیوں؟ مجھے محمد علی پاشا اور ممالیک کا زمانہ یاد آگیا — اسی قلعہ میں محمد علی پاشا کی کچہری لگتی تھی۔ وہ اپنی سفید ڈاڑھی اور عقابی نگاہوں کے ساتھ یہاں بیٹھتا تھا۔ امین بک شاہین یاد آگیا — میری ہر چیز جب کیپٹن اور اس کے دیو ہیکل کارندے نے لے لی اور مجھے بالکل خالی ہاتھ کر دیا تو مجھے تیزی کے ساتھ تنگ دروازے کی طرف دھکیل دیا گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی ایک ایسا منظر دکھائی دیا جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور مجھے یقین ہے کہ میری زندگی کے آخری لمحات تک یہ منظر میرے ذہن سے محو نہ ہوگا۔

دروازے کے اندر میں نے قدم رکھا ہی تھا کہ اسے فوراً بند کر دیا گیا۔ میرے قدموں نے محسوس کیا کہ آگے دو تین سیڑھیاں ہیں۔ میں سنبھلتے سنبھلتے ان پر اتر گیا۔ میں نے سامنے کھلی جگہ پر نظر دوڑائی۔ دھوپ داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں تھیں جن کے دروازے

گھلے ہوئے تھے۔ ہر کوٹھڑی کی پیشانی پہ نمبر درج تھے۔ انسانوں کا ایک عجیب و غریب گروہ قطار اندر قطار کھڑا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ مجبور انسان قلعہ کی حوالات میں تشدّد و تعذیب کی بھرپور رات گذارنے کے بعد اب بیت الخلا جانے کے لیے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

یہ تیس یا چالیس آدمی ہوں گے۔ اُن میں سے ہر شخص درد سے کراہ رہا تھا۔ اُن پر جو وحشیانہ طریقے سے تشدّد کیا گیا تھا اُس کی وجہ سے اُن کے چہرے مسخ ہو رہے تھے۔ ان میں سے دو آدمیوں نے ایک تیسرے شخص کو ہاتھوں پہ اُٹھا رکھا تھا جس کے دونوں پاؤں بُری طرح سُوج رہے تھے۔ جسم کے مختلف حصّوں کی پھٹی ہوئی کھال میں سے پیپ ٹپک رہی تھی، چہرہ بُری طرح سُوجا ہوا تھا، اُسے جگہ جگہ سے نوچا گیا تھا اور اس کی وجہ سے بے شمار سُرخ اور نیلے نشان پڑے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے اس کے چہرے کے نقش و نگار واضح نہ ہو رہے تھے۔ یوں نظر آتا تھا جیسے اس انسان نے کوئی غلیظ اور بدنما لباس اوڑھ رکھا ہو تاکہ اس سے دوسروں کو خوفزدہ کیا جائے۔ ایک اور شخص نظر آیا۔ اُس کا سر بُری طرح پھٹا ہوا تھا اور سُرخ خون کی دھاریں اُس کے سیاہ بالوں میں سے گزر رہی تھیں۔ گویا تلوار کے ساتھ اُس کے سر میں چھید کیے گئے ہوں۔ ایک چوتھا انسان پیٹ کے بل رینگ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں پر اور دوسرے حصّوں پر اس اس قدر شدید ضربیں لگ چکی تھیں کہ اُس سے چلا نہ جا رہا تھا۔ اُسے اُٹھانے والا بھی کوئی شخص نہ تھا۔ سب لوگ اُن افراد کو اُٹھا رہے تھے جن میں رینگنے کی سکت بھی نہ تھی ——— یہ تھی وہ "معمولی مار" جس کے بارے میں پہرہ دار نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ اور یہی وہ "معمولی مار" اُس نئی دُنیا کے انجانے سفر میں میرا بشدّت انتظار کر رہی تھی

میں چُپ چاپ کھڑا ان مناظر کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی ہولناکی کی وجہ سے میری زبان خشک ہو رہی تھی۔ لیکن یہ بھی دلچسپ پہلو ہے کہ میرے اندر خوف باقی نہ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ حالات دیکھتے ہی میرے دل سے خوف زائل ہو گیا تھا۔ اور ابھی تک میں اس امر کی کوئی توجیہ نہیں کر سکا کہ کیوں خوف کی جگہ بے خوفی نے یکایک میرے دل میں گھر کر لیا۔ اچانک میرے سامنے ایک نوجوان آیا۔ گندمی رنگ کا۔ عمر تقریباً ۳۵ سال۔ اُس کی باریک باریک اوپر کو اُٹھی ہوئی مونچھیں جیسے نیا سوڈانی کوڑا جسے اب تک استعمال نہ کیا گیا ہو۔ یہ نوجوان کس طرف سے آیا۔ یہ مجھے نہیں معلوم ہو سکا۔ میں اس قطار کو دیکھنے میں منہمک تھا جو بیت الخلاء کے انتظار میں لگی ہوئی تھی

یہ نوجوان میری طرف بڑھا، بالکل میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، اور گہری نظروں سے مجھے تاکنے لگا۔ گویا کہ وہ یہ مطالعہ کر رہا تھا کہ میرے ظاہر کے پیچھے میرا باطن کیسا ہے۔ میں بھی اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ اور پھر اس نے مجھ سے پوچھ ہی لیا: کیا تم احمد رائف ہو؟ ——— جی ہاں، میں احمد رائف ہوں۔ یہ جواب سنتے ہی اس نے بجلی کی طرح اچانک میرے منہ پر زور سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ میری آنکھوں سے غصّے کے شرارے چھوٹنے لگے۔ پھر اس کے منہ سے موسلا دھار بارش کی طرح گالیاں برسنے لگیں۔ اور گالیوں کی ڈکشنری میں ——— اگر ایسی کوئی ڈکشنری دنیا میں موجود ہے ——— جو سب سے زیادہ غلیظ اور مبتذل گالیاں ہوسکتی تھیں وہ اس نے مجھے پیش کیں۔ میں نے بے شعوری کے عالم میں اس کا گریبان پکڑ لیا اور اعصابی حالت میں بغیر دیکھے بھالے اُسے دیوار کے ساتھ دے مارا۔ اور اسے ڈانٹ کر کہا: تم کیوں مجھے اس طریقے سے مارتے ہو؟ ——— تم یقیناً پاگل ہو اس ملک کا ایک دستور ہے، قانون ہے، پارلیمنٹ ہے۔ اگر تم ان چیزوں کو بھول رہے ہو تو کیسے کا مزہ چکھوگے!! ——— ان دنوں میں یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ میرے ملک کے اندر انسانوں سے ایسا بھی سلوک کیا جا سکتا ہے۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہوتا رہا اور پاس کھڑے ہوئے نظر بندوں میں سے کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔

چند سپاہی میری طرف فوراً لپکے ——— میرے ہوش بھی ٹھکانے آگئے ——— اور یہ تلخ اور ہولناک حقیقت مجھ پر عیاں ہوگئی کہ اب میں ایسی جگہ ہوں جہاں میں کچھ نہیں کر سکتا اور اپنی ذات کے لیے کسی نفع یا نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اللہ کی مرضی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے، وہ ذاتِ بزرگ و برتر جو چاہے کرے۔ سپاہی میری تکا بوٹی کرنا چاہتے تھے۔ مگر اس نوجوان نے انہیں روک دیا جس نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام احمد راسخ تھا۔ جب مجھے کچھ سکون نصیب ہوا تو وہی نوجوان مجھے ہاتھ سے پکڑ کر آگے لے چلا۔ ہم راستوں اور گلیوں سے گزر رہے تھے جن کے دونوں طرف تنگ و تاریک کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ جیسے موت کے سایے لہرا رہے ہوں۔ یہ تھا اس المناک صبح کا آغاز ——— گلی کے خاتمے پر لکڑی کی سیڑھی تھی جو دوسری منزل پر جانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس نوجوان افسر

کے پیچھے پیچھے میں بھی سیڑھی پر چڑھ گیا۔ یہ خوفناک اور دلگداز مناظر دیکھ کر ہونٹوں پہ مہر لگ چکی تھی۔ جذبات منجمد ہو گئے تھے۔ احساس و شعور کی رگ سرد پڑ چکی تھی۔

سیڑھی ختم ہوتے ہی ایک چھوٹا سا کمرہ سامنے آیا۔ یہ کمرہ دو بڑی بیرکوں کے درمیان واقع تھا۔ ان میں سے ایک بیرک تقریباً ۲۰ میٹر لمبی اور دس میٹر چوڑی تھی۔ میں نے بائیں طرف مڑ کر دیکھا کہ بیرک میں کوئی فرنیچر وغیرہ نہیں ہے۔ صرف ایک لکڑی کا تخت، دو یا تین کرسیاں اور ایک چھوٹی سی میز جو بالعموم اسکولوں میں ہوتی ہے۔ وہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا۔ البتہ دیواریں مدھم خون کے فواروں سے رنگیں تھیں۔ وہاں میں نے موت کی بو محسوس کی۔ پھر دائیں طرف جھانکنے لگا۔ احمد راسخ بھی خاموشی کے ساتھ میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر تمسخر انگیز تبسم تھا۔ اس نے جب مجھے دائیں جانب کی بیرک کو تکتے ہوئے دیکھا تو اپنے ہاتھ سے بیرک کے اندر موجود لوگوں کی طرف اشارہ کیا ــــــــ یکلخت میں نے شور و غل سُنا۔ شدید شور و غل۔ درد و کرب سے لبریز آوازیں۔ انسانوں کی چیخیں جو درندوں کے آگے آگے دوڑتے تھے اور وہ مسلسل ان کے درپے تھے۔ اب مجھے خوف محسوس ہوا۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ ایک اور منظر۔ انسان بیرک کے طول میں گھوم گھوم کر دوڑ رہے ہیں۔ ان کے لباس اُترے ہوئے ہیں۔ بالکل مادر زاد ننگے انسان۔ ان کے ہاتھ آہنی زنجیروں میں بندھے ہیں۔ بیرک کے ہر گوشے میں تین سپاہی کھڑے ہیں۔ ہر سپاہی کے ہاتھ میں لاٹھی ہے جو اُس کے قد سے بھی زیادہ لمبی ہے۔ ان بدنصیب انسانوں پہ یہ سپاہی ان لاٹھیوں کی بارش کر رہے تھے۔ میں نے سراسیمگی اور حواس باختگی کے عالم میں احمد راسخ کو دیکھا۔ ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے مجھ سے پوچھا:

ان لوگوں میں سے کسی کو آپ جانتے ہیں؟

ہرگز نہیں!

اچھی طرح نظر ڈالیں۔

میں نے از سرِ نو نظر دوڑائی۔ اور یکبارگی صدمے کی وجہ سے میں زمین پہ گرا چاہتا تھا۔ فی الواقع ان بدنصیب انسانوں کے اندر تین میرے دوست تھے جنہیں میں پہلی نظر میں پہچان

نہ سکا تھا۔ اِس لیے کہ سب لوگ بالکل بے ہنر تھے۔ احمد راسخ نے مجھے پھنکارتے ہوئے کہا: دیکھ لیا آپ نے ملکی دستور اور ملکی قانون اور پارلیمنٹ۔ ہے اِن خرافات کی کوئی حقیقت؟ میں مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ یہ معاملہ جواب اور دلیل سے بالاتر ہے۔ اُس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔ اِس بار اُس کی آواز زیادہ گرجدار تھی اور ہر طرف سے گونج رہی تھی۔ کہنے لگا:

آؤ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ بتاؤ؟

میں نے بے ساختہ کہا: کیا بتاؤں؟

معلوم ہوتا ہے تم کچھ تھکے ہوئے ہو۔

ہرگز نہیں۔ آپ سوال کریں۔ میں جواب دوں گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بات آپ سے چھپا کر رکھوں۔

ارے بدبخت! ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں۔

اُس وقت تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیا قصہ ہے؟ کیا چیز ان لوگوں کو بتاؤں؟ لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ اگر میں نے ان لوگوں سے کوئی بات نہ کی تو یہ مجھے مار مار کر ختم کر دیں گے، اور میں نے زندگی میں آج تک زدوکوب کا مزہ نہ چکھا تھا۔ صرف وہ ایک مجنونانہ تھپڑ جو احمد راسخ نے مجھے رسید کیا تھا۔ اُن دنوں وہاں انسانوں پر جو کچھ بیت رہی تھی اُس کے مقابلے میں وہ تھپڑ تو ایک معمولی بات تھی۔

احمد راسخ مجھے اُٹھا کر بیرک کی طرف لے گیا اور لکڑی کے بنچ پر بیٹھ کر مجھ سے کہنے لگا: کہو، کیا کہتے ہو؟ میری زبان پھر خشک ہوگئی۔ میں انتہائی بدحالی اور خستگی میں مبتلا ہوگیا۔ اُس کے چہرے پر میری نگاہیں گڑ گئیں۔ ایک لفظ بھی میرے منہ سے نہ نکل سکا۔ میں یہ نہ جانتا تھا کہ کس موضوع پر کیا کہوں۔ میں نے دبی زبان سے احمد راسخ سے کہا: کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھ سے پوچھیں اور میں آپ کے ہر سوال کا جواب دیتا جاؤں۔ اُس نے ایک خوفناک اور کرخت قہقہہ لگایا۔ اور پھر گلا پھاڑ کر جلاد کو بلایا۔ اتنا کہنا تھا کہ چار جلاد لپک پڑے۔ اُن کی آنکھوں سے غیظ آلود شرارے برس رہے تھے۔ لمحوں میں انہوں نے ویسی ہی لاٹھیاں اُٹھا رکھی تھیں جن کا میں ابھی

ذکر کرتا ہوں۔ اُن کے چہرے سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اُس کام کو بخوبی سمجھ رہے ہیں جو اُن سے کروایا جانے والا ہے۔

آدھے منٹ کے اندر میرے کپڑے اُتار کر مجھے ننگ دھڑنگ کر دیا گیا۔ تعذیب کے کولہو میں مجھے جوت دیا گیا۔ ہر طرف سے مجھ پر لاٹھیاں برسنے لگیں۔ گویا کمرے کی چھت لاٹھیوں اور آگ کے کوڑوں کی بارش کر رہی ہے۔ یہ ضربات مجھے اس قدر شدید اذیت دیتیں کہ بیان سے باہر ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرے جسم اور میری جان کے ٹکڑے اُڑ اُڑ کر ہوا میں تحلیل ہو رہے ہیں اور اُس عذاب الیم کے دھوئیں کا جزو بن رہے ہیں جس سے پوری بیرک بھری ہوئی تھی۔ خیال ہے کہ پورے ایک گھنٹے تک ضد و کرب کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ گھنٹہ بھی میرے لیے صدیوں سے کم نہ تھا۔ خستہ و درماندہ زمین پہ گر گیا۔ ایک بے جان لاشہ۔ بایں ہمہ سپاہیوں نے مجھے نہ چھوڑا۔ اپنی لاٹھیاں اور تازیانے لے کر میرے ارد گرد جمع ہو گئے اور مجھے مارنے لگے ۔۔۔ ـــــ بالکل اس طرح جیسے قصاب ذبح شدہ دُنبے کو لٹکا کر اُس میں ہوا بھرتا ہے اور پھر اُسے ڈنڈے سے مارتا ہے تاکہ آسانی سے اُس کی کھال اُتاری جاسکے۔

ہماری کھال اُتارنے کا یہ فعل انٹیلی جنس والوں کی اصطلاح میں "تحقیق و تفتیش" تھا۔ چند لمحات گزرے ہوں گے کہ احمد راسخ نمودار ہوا۔ اُس کے کشادہ قدموں کے سامنے تعذیب کے آلات دیکھ رہا تھا جنہیں وہ گھسیٹ کر لا رہا تھا۔ ان آلات سے جو جھنکار اُٹھ رہی تھی وہ جری سے جری انسان کے بدن میں بھی جھرجھری پیدا کر دینے والی تھی۔ وہ بڑی درندگی اور سنگدلی کے ساتھ مجھ سے کہنے لگا:

آؤ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ بتاؤ۔

میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس نے مزید کہا: فیلڈ مارشل نے ہمیں اجازت دے دی ہے کہ تم میں سے پچاس کتوں کو ہم مارنا چاہیں تو مار ڈالیں۔

میرا ذہن غبار آلود ہو گیا۔ لیکن میں نے اپنے بدن کے اندر ایک لذیذ مستی سرایت کرتی ہوئی محسوس کی۔ سوچا لو اب چھٹکارا قریب تر ہو گیا ہے۔ چند لمحوں کی بات ہے۔ یہ انسان نما درندہ مخلوق میرے قتل کا فیصلہ کر دے گی اور میں انہیں پاؤں سے مسلتا ہوا اللہ تعالیٰ کی

وسیع بارگاہ میں پہنچ جاؤں گا - سوچ کے چند حیرت انگیز لمحات مجھ پر طاری ہو گئے - کیا جب میں مرجاؤں گا تو شہادت نصیب ہوگی ؟ میں ان پاکیزہ و بلند خیالات میں محو تھا کہ تعذیب کا سلسلہ شروع ہو گیا - یہ مار پیٹ کا نیا دور تھا - مگر اب زیادہ درندگی اور وحشتناکی کا مظاہرہ کیا گیا - میں جان لیوا ضربات کے اندر اُس سے کہہ رہا تھا : مجھے بتا دو کہ کس موضوع کے بارے میں تم چاہتے ہو کہ میں بات کروں ؟ اُس نے ایک لفظ کہا جس سے بات کا راستہ کچھ واضح ہوا - مگر وہ لفظ سُنتے ہی مجھے تاریکی نے پھر دبوچ لیا - وہ ایک ہی لفظ تھا - مگر اس میں تیزی تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تھی - وہ تھا : " اخوان المسلمون " میں نے حیرت کے ساتھ اُس سے کہا : اخوان المسلمون کی کونسی بات کے بارے میں کہوں ؟ اُس نے کہا " اُن کی تنظیمیں - سازش - ہتھیار - ٹریننگ دینے والے ، ہر چیز کے بارے میں بتاؤ " ——— یہ کہا اور پھر زدوکوب بڑی سخت ، تند اور رُوح فرسا -

اس حالت میں کتنا وقت گزرا - میں کچھ نہیں جانتا - مجھ پر غنودگی چھائی رہی - جب ہوش آیا تو یوں محسوس ہوا کہ میں عالمِ خواب میں ہوں - دن آدھا گزر چکا تھا - احمد راسخ بیرک سے جا چکا تھا - دوسرے متعدد فوجی افسر آ چکے تھے - سپاہی اُسی طرح کے ڈیسک لے آئے جو اسکول کی کلاسوں میں ہوتے ہیں - ہر فوجی افسر بیرک کے ایک کونے میں جا بیٹھا - میرے جیسے دوسرے نظر بندوں کو ایک ایک فوجی افسر کے سامنے پیش کیا جاتا رہا - مجھے انھوں نے کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیا -

یہ نازک اور جان گسل دن گزرنے سے پیشتر ہی میں "تحقیقات کی کارروائی" کے دوران اصل کہانی سمجھ چکا تھا - فوجی افسر اُن ملزموں سے یقین کے ساتھ کہہ رہے تھے اخوان المسلمون نے ضرور کوئی سازش تیار کی ہے - مگر ملزم بے خودی اور وارفتگی کی حالت میں مبتلا تھے - یہ سب لوگ گو اخوان المسلمون کے ارکان تھے مگر انھیں فوجی افسروں کی یقین دہانی کے باوجود اس امر کا قطعاً علم نہ تھا کہ اخوان نے جمال عبدالناصر کی حکومت کے خلاف کوئی سازش تیار کی ہے اور شمس بدران (سابق وزیر جنگ) کی سرپرستی میں ملٹری انٹیلی جنس نے اسے بروقت پکڑ لیا ہے - خود سول انٹیلی جنس کو ایسی کسی سازش کا کوئی علم نہیں تھا - یہ معاملہ بنیادی طور پر ملٹری

انٹیلی جنس کی نگرانی میں تھا۔ اور جنگی جیل کے اندر اصل تحقیقاتی کارروائی کی جا رہی تھی۔ ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ اس بات کی اجازت نہ دیتے رہے تھے کہ اس کہانی کے بارے میں کسی قسم کی معلومات سول انٹیلی جنس کے افسران تک پہنچ جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سول انٹیلی جنس کے لوگ بھی ہر ایرے غیرے کو پکڑ لیں اور اس معاملے کے بارے میں وہ بھی کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔

اُن دنوں فوج کی کریمنل انٹیلی جنس کا شعبہ مصر کا اصل حکمران ادارہ تھا۔ اس کے فیصلے قضاء اور قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ مصری عدلیہ کے فیصلوں کو چیلنج کیا جا سکتا تھا اور اس کے احکام کو رد کیا جا سکتا تھا، مگر اِس شعبے کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس شعبے کا سربراہ بریگیڈیر سعد زغلول عبدالکریم تھا جو براہ راست شمس بدران کے ماتحت تھا۔ شمس بدران فیلڈ مارشل عبدالحکیم عامر کے دفتر کا انچارج تھا، اور چونکہ عبدالحکیم عامر شدید ذمہ داریوں کے اندر دبا ہوا تھا، اِس لیے اُس نے تمام اختیارات اپنے دفتر کے انچارج کو دے رکھے تھے تاکہ وہ مصر کی "بہبود و فلاح" کے لیے جو مناسب اقدام ہو کرتا رہے۔ یہ شخص بالکل مطلق العنان تھا۔ خلقِ خدا کے ساتھ جو سلوک چاہتا تھا کرتا تھا۔ عبدالحکیم عامر کی طرف رجوع کرنے یا اُس سے کوئی بات دریافت کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

بیرک کے فوجی افسروں کے پاس ایک ایک شخص کو تحقیقات کے لیے بلایا جاتا اور اُسے اس قدر مارا جاتا کہ وہ حواس کھو بیٹھتا۔ وہ کچھ بات بھی نہ کر سکتا تھا کیونکہ اُسے کہانی ہی سرے سے معلوم نہ تھی۔ پھر دوسرا شخص لایا جاتا اور اس کے سامنے بھی یہی داستان دُہرائی جاتی۔ پھر تیسرا...... پھر چوتھا.....

سپاہی لوگوں کو بہت شدت کے ساتھ مارتے تھے یہاں تک کہ لوگ یہ اقرار کر لیتے کہ وہ واقعی مجرم ہیں۔ تحقیقاتی افسر صرف اس بات پہ اکتفا نہ کرتا کہ کسی شخص نے اقرارِ جرم کر لیا ہے۔ بلکہ اُس شخص کا یہ فرض تھا کہ وہ تحقیقاتی افسر کو اپنے مُجرم ہونے کا پوری طرح قائل کرے اور جو جھوٹی باتیں وہ اپنے آپ کی طرف منسوب کر رہا ہے اُن میں اگر کوئی خامی یا خلا، رہ گیا ہے تو اُسے اچھی طرح پُر کرے۔ اُس خون آشام دن میں مَیں نے وہاں جو کہانیاں خود سُنیں اور جو میرے سامنے روایت کی گئیں ان میں سے ایک کہانی "چاول کی بوری" کے عنوان سے مشہور ہوئی۔ وہ

کہانی یہ تھی:

مصلح زریق نامی مزدور ایک ایسی کمپنی میں مزدوری کرتا تھا جو ملک کے مختلف حصوں میں سڑکیں پختہ کرنے کا کام کرتی ہے۔ ۱۹۶۰ء کی بات ہے یہ کمپنی دمیاط شہر کے قریب کسی سڑک کو پختہ کر رہی تھی۔ یہ پورا علاقہ اچھی قسم کے چاول پیدا کرنے میں شہرت رکھتا ہے مصلح زریق جب اپنے کام سے فارغ ہوا اور قاہرہ واپس لوٹنے لگا تو اس نے اپنے ایک ساتھی احمد السید اسماعیل کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قریبی قصبہ جس کا نام کفر البطیخ ہے سے گزرتے چلیں۔ وہاں چاولوں کا ایک تاجر رہتا ہے عبدالفتاح اسماعیل۔ اسی حیثیت سے وہ مشہور تھا۔ عبدالفتاح اسماعیل اخوان المسلمون کی تیسری نسل کے لیڈروں میں سے تھا۔ مسکین مصلح زریق کے ذہن سے یہ پہلو اوجھل ہو گیا۔ مصلح اور اس کا ساتھی احمد السید اسماعیل کفر البطیخ کی طرف چل دیے تاکہ دمیاط کے اعلیٰ قسم کے چاولوں کی ایک بوری خرید سکیں۔ اگر ان دونوں انسانوں کو یہ خبر ہوتی کہ اس شوق کے سبب ان پر کیا وبال ٹوٹنے والا ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ پر چاول حرام کر لیتے بلکہ اپنے بعد آنے والی نسلوں پر بھی قیامت تک چاول حرام ٹھیرا دیتے۔

دونوں ساتھی کفر البطیخ پہنچ گئے اور عبدالفتاح اسماعیل کا پتہ دریافت کرنے لگے شومئی قسمت کہیے یا تقدیر کہ وہ دونوں انٹیلی جنس کے کسی کارندے سے ملے جو اتفاق سے انہیں راہ چلتے مل گیا۔ اس سے وہ عبدالفتاح اسماعیل کا پتہ ابھی پوچھنے نہ پائے تھے کہ اس نے دونوں سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ اور ان سے شناختی کارڈ لے کر ان کے نام ڈائری میں نوٹ کرنے شروع کر دیے۔ پھر ان کی آمد کا سبب پوچھ کر انہیں نصیحت کی کہ وہ واپس لوٹ جائیں اور آئندہ اس بستی میں نہ آئیں۔ انٹیلی جنس کے کارندے نے اس کی رپورٹ لکھی اور اپنے دفتر کو پیش کر دی۔ چونکہ یہ واقعہ معمولی اور ہیچ تھا اس لیے اس رپورٹ پر دھیان دینے کی ضرورت نہ محسوس کی گئی۔ البتہ عبدالفتاح اسماعیل کی فائل میں اسے منتقل کر دیا گیا۔ مصلح اور احمد السید اسماعیل الٹے پاؤں واپس چلے گئے اور پھر یہ بات بھی نسیاً منسیاً ہو گئی۔

کئی سال گزر گئے۔ ۱۹۶۵ء کا سال آ گیا۔ عبدالفتاح اسماعیل گرفتار کر لیا گیا۔ اور تحقیقاتی کارروائی کے لیے اسے جنگی جیل میں بند کر دیا گیا، یعنی ملٹری انٹیلی جنس کے پاس۔ سول انٹیلی جنس، جو اس

پوری کہانی سے بے خبر تھی ، آخرکار جب اُس کے علم میں یہ مسئلہ آیا تو اُس نے بھی اس کا مطالعہ اور تحقیق شروع کر دی ۔ عبدالفتاح اسماعیل کی فائل میں منسلکہ رپورٹوں کے اندر جن لوگوں کے نام درج تھے اُن سب کو گرفتار کر کے اُن کے خلاف تحقیقات شروع کر دی ۔ مصلح اور اس کے ساتھی پر بھی وہ گھڑی آوارد ہوئی جو اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی ۔ یہ دونوں بھی گرفتار ہو چکے تھے ۔ فوجی افسران یہ کوشش کرتے رہے کہ مصلح زریق یہ بتائے کہ چند سال پیشتر کفرالبطیخ جا کر وہ عبدالفتاح اسماعیل کو کیوں تلاش کر رہا تھا ؟ وہ کیا راز تھا ؟...... مسکین بالکل آسان اور سیدھا سادھا سا جواب دے دیتا تھا کہ وہ اور اُس کا ساتھی دمیاط کے چاول خریدنے کے لیے گئے تھے ۔ مگر اُس کا یہ جواب اُس کے عذاب میں کمی کے بجائے اضافہ کر دیتا ۔ اس مسکین کے سر پر عذاب و اذیت کی آگ کی بارش کی گئی ۔ کبھی لاٹھیوں کی بارش ہوتی ۔ کبھی نوبہ کے علاقے یا سوڈان کے گندھے ہوئے تازیانوں کی ۔ مصلح مسکین بڑی چیخیں مارتا ۔ اُس کی زبان سے مختلف الفاظ نکلتے ، کچھ بامعنی اور کچھ بے معنی ، جو ایسی زبان سے تعلق رکھتے جنھیں انسانی مخلوق نہیں سمجھتی ۔ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ (ہر طرف سے موت اُس پر حملہ کرتی مگر وہ نہ مر پاتا) ۔

جب جلاد تعذیب کی کارروائی سے ہانپ جاتا اور کچھ سستانے لگتا تو مصلح بلند آواز سے واویلا کرتا : خدائے عظیم کی قسم ہم نے صرف چاول خریدنے کی خاطر عبدالفتاح اسماعیل کا پتہ پوچھا تھا ۔ حضور ، ہم صرف ایک بوری چاولوں کے لیے وہاں گئے تھے ۔ مگر فوجی افسر نے اُسے جواب دیا : کتے کے بچے ! چاولوں کی بوری کے لیے گئے تھے یا ہتھیاروں کی بوری کے لیے ؟ مصلح زریق نے جب یہ جواب سنا تو اُسے عذاب سے جان چھڑانے کا موقع ہاتھ آ گیا ۔ وہ پورے زور سے چیخا گویا اُس پہ پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو ۔

" حضور آپ نے کیا فرمایا ؟ ہتھیاروں کی بوری ؟ جی ...... جی ...... ہم جب کفرالبطیخ گئے تھے تو یہی چیز ہمارے پیش نظر تھی ۔ حقیقت بہرحال کھل کر ہی رہتی ہے ۔ ہم ہتھیاروں کی بوری کی خاطر وہاں گئے تھے ۔ ہاں بے شک ہمیں ہتھیاروں کی بوری چاہیے تھی " ۔ مصلح اس حالت جنون میں ہنس بھی دیا ۔ تعذیب کا کولہو رک گیا ۔ تحقیقاتی کارروائی کا رخ بھی بدل گیا ۔

اب وہ دوسرے رُخ پر چل پڑی۔ عجب ستم ظریفی دیکھنے میں آئی۔

یہ المیہ بھی تھا اور طربیہ بھی۔ یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ المیہ تھا یا طربیہ۔ مصلح کی بیڑیاں کھول دی گئیں، عذاب بھی ختم کر دیا گیا۔ کیونکہ اُس نے تسلیم کر لیا کہ اُس نے ہتھیاروں کی ایک بوری کفرالبطیخ سے کسی اور جگہ منتقل کی تھی۔ احمد السید اسماعیل نے بھی مصلح کی روایت کی بڑے جوش وجنون کے ساتھ توثیق کر دی۔ دونوں کے سامنے سوال یہ تھا کہ وہ اس کہانی کی توثیق کرنا پسند کرتے ہیں یا موت!

وزارتِ داخلہ میں تبدیلی آچکی تھی۔ سول انٹیلی جنس بھی حرکت میں آگئی تھی۔ قلعہ کی جیل میں کرنل احمد صالح داؤد آیا جو سول انٹیلی جنس کا رکنِ رکین سمجھا جاتا تھا۔ وہ بذات خود تحقیقات کی نگرانی کے لیے آیا۔ مصلح کے لیے اب یہ ناگزیر ہو گیا کہ وہ ان ہتھیاروں کا پتہ بتائے جن کے بارے میں اس نے اعتراف کیا ہے —— جھوٹا اعتراف —— کہ وہ اس نے کفرالبطیخ سے باہر منتقل کیے ہیں —— مصلح نے فوری طور پر اُس کا جواب بھی سوچ لیا۔ یہ قضیہ چونکہ اخوان المسلمون سے متعلق ہے لہٰذا یہ ہتھیار بھی ان کے قبضے میں ہی ہونے چاہییں۔ اُس کے ذہن میں اخوان کے دو آدمی آگئے جو اُس کے محلّے میں رہتے تھے۔ اور یہ دونوں ابھی ابھی ۱۹۶۴ء میں جیل سے رہا ہوئے تھے۔ ایک احمد شعلان اور دوسرا زکریا المشتولی —— ہم تیسرے کا بھی ذکر کیے دیتے ہیں۔ بدر القصبی۔ اللہ تعالیٰ ان تینوں پر اپنی رحمت و مغفرت کی بارش برسائے۔

مصلح نے بیان دیا کہ ہتھیار ان تینوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو دیے گئے ہیں۔ پوری طرح یاد نہیں ہے۔ چنانچہ ان تینوں کو فیوم جیل سے یہاں قلعہ میں لایا گیا۔ اور ان تینوں کو بڑی زہرہ گداز اور بہیمانہ تعذیب دی گئی —— تینوں اسی تعذیب میں شہید کر دیے گئے۔ ان میں سے ایک زکریا المشتولی کی لاش کو خود میں نے اُٹھایا۔ خدا اُس پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے۔ یہ تینوں مار مار کر شہید کر دیے گئے مگر انہیں تا دمِ آخر ہتھیاروں کی بوری کا نسخہ معلوم نہ ہو سکا۔ وہ اس کہانی سے بالکل بے خبر تھے۔

جیل والوں کا طریقہ یہ تھا کہ جو نظر بند تعذیب سے مر جاتا کاغذات میں اس کے نام کے

آگے "مفرور" کا لفظ لکھ دیا جاتا۔ جیل کا ریکارڈ جب پولیس والوں کو پہنچتا تو وہ لوگ "مفرور" کے گھر پر جا چھاپہ مارتے، گھر کا ساز و سامان توڑ پھوڑ دیتے، پورے گھر میں تباہی مچا دیتے، جو ملتا اُسے زدوکوب کرنے لگتے۔ بعض اوقات گھر کے مردوں اور عورتوں تک کو جیل میں لے آتے۔ اس الزام میں کہ ان لوگوں نے "مفرور" کو بھاگنے میں مدد دی ہے —— اور "مفرور" بے چارا زندگی کی آزمائشوں اور بوجھوں سے نجات حاصل کر کے اپنے رب کے حضور پہنچ چکا ہوتا تھا۔ رہا مصلح زریق، تو وہ اور اس کا ساتھی قلعہ سے جنگی جیل بھیج دیے گئے۔ وہاں ملٹری انٹیلی جنس کے افسروں نے —— جو مصر کے اصل اصحاب اقتدار و ارباب جاہ تھے —— چند روز کے بعد ہی ان دونوں کو رہا کر دیا۔

میں وہ تاریخی لمحات نہیں بھول سکتا جب میں قلعہ میں ایک مرتبہ یہ دیکھ کر کہ نگران فوجی افسر دوپہر کے کھانے کے لیے چلا گیا ہے مصلح زریق کے قریب ہو گیا اور اُس سے کہا:

جو بات ابھی ابھی تمہارے منہ سے نکلی ہے (یعنی "اقبال جرم") اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ غلط ہے۔ لیکن یہ بھی امکان ہے کہ یہ بیان تمہیں لیمان طرہ کی جیل میں پہنچا دے۔

مصلح نے بھٹکی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا: آپ کا کیا مطلب؟

میں نے ازراہ تعجب اُس سے کہا: تمہارا "اقبال جرم" ۲۵ سال قید بامشقت سے عبارت ہے۔

اب اُس نے مجھے ذرا سنجیدہ اور خوف سے لرزتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور پوچھا،

"وضاحت سے بتائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں"۔

میں نے کہا: جب یہ واقعہ ہی پیش نہیں آیا (یعنی چاولوں کی بوری کے بجائے ہتھیاروں کی بوری وصول کرنے کا) تو تمہیں لازماً اپنے بیان سے رجوع کرنا پڑے گا۔

اُس کی نگاہیں جو خوف و ہراس سے لبریز تھیں، اب وہ حقارت کا پیکر بن گئیں۔ اُس نے مجھے بآواز بلند کہا: آپ بیوقوف معلوم ہوتے ہیں۔

میں؟

جی ہاں! خدا کی قسم۔ اگر "اقبالِ جرم" کی پاداش میں مجھے دو سو پچاس سال بھی جیل میں ڈال

دیا جائے تو میں اپنے بیان سے سرِ مُو بھی انحراف نہ کروں گا!!
میں نے اُسے کہا: اچھا تو کیا تو مجھے یہ اجازت دے گا کہ میں فوجی افسر کو اصل واقعہ سمجھا دوں (یعنی یہ کہ ہتھیاروں کی بوری وصول کرنے کا قصہ جھوٹ ہے) - ؟

وہ یہ سُن کر بے تحاشا رونے لگا - اور مجھے خدا کا واسطہ دے کر کہنے لگا کہ میں ایسی کوئی بات افسروں سے نہ کہوں ——— اور آخر مجھے ان افسروں سے بات بھی کیا کرنی تھی - میں خود مصائب و شدائد اور آفات و بلیات کے نرغے میں تھا -
میری اور مصلح کی گفتگو یکدم منقطع ہو گئی - کیونکہ جیل کے افسر واپس آ گئے - اب اُن کے پیٹ طعام و شراب سے پُر تھے - اور مظلوم قیدیوں کو تعذیب کی وجہ سے جو طاقت وہ کھو چکے تھے وہ اب عود کر چکی تھی -

جو باتیں قابلِ ذکر ہیں اُن میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ ان دنوں احمد صالح داؤد فوجی افسروں سے ملاقات کے لیے قلعہ آیا تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ تحقیقات کی رفتار کیا ہے اور ان کا رُخ کدھر ہے - طویل اجتماع کے بعد، احمد صالح داؤد جیل کے صحن میں ایک افسر کے ساتھ باتیں کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا - مجھے جہاں عذاب دیا جا رہا تھا یہ جگہ وہاں سے صرف چند میٹر کے فاصلے پر تھی - میں نے احمد صالح داؤد کو یہ کہتے سُنا: "دوستو، یہ لازماً پیشِ نظر رکھو کہ ایک ایسی تنظیم ضرور پائی جاتی ہے جس میں اخوان المسلمون کے تمام افراد شامل ہیں" - دوسرے فوجی افسر نے اُسے جواب دیا: "پاشا صاحب! اب تک تحقیقات کے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں اُن سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی"۔ پاشا صاحب نے تندی کے ساتھ اُسے ٹوکتے ہوئے کہا: "صدر صاحب فرماتے ہیں: ملک میں ایسی تنظیم ضرور پائی جاتی ہے - ایسی تنظیم ہونی چاہیے - سمجھے آپ - اِسی نہج پر تفتیش جاری رہنی چاہیے - تم لوگوں کے حوصلے کہاں گئے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ بعض نظر بند ابھی تک پاؤں کے بل چل پھر رہے ہیں"۔
احمد صالح داؤد کے دورہ کے بعد تعذیب کی مردافگن چکی پھر چل پڑی، جو افسروں کی باہم ملاقات کے دوران کچھ دیر کے لیے رُک گئی تھی - اب اس چکی کی سنگینی اور درندگی اور زیادہ بڑھ گئی تھی تاکہ آئندہ کوئی پاؤں کے بَل بھی نہ چل سکے - یہ لوگ تمام نظر بندوں کو موت کے گھاٹ اتارنے پر

(دیکھیے صفحہ ۴۷)

رسائل و مسائل

حضورؐ کی تاریخ وفات و ولادت

سوال:۔ میرے دل میں سخت پریشانی ہے کہ فرقہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ سرکار رسالت مآبؐ کی وفات و ولادت ۱۲ ربیع الاول ہے، اور فرقہ شیعہ کا خیال ہے کہ حضورؐ کی پیدائش ۱۷ ربیع الاول اور وفات ۲۸ صفر ہے۔ حضورؐ کی وفات کے وقت اہل بیتؓ وصحابہ کرامؓ دونوں موجود تھے۔ اختلاف کیوں ہوا اور کب ہوا؟ اصحاب محمدؐ و اہل بیت محمدؐ کے زمانے میں اُن کا کیا عمل تھا؟ طبیعت پریشان ہے۔

جواب:۔ اہلِ سنّت کی روایات میں اس بات پر اتفاق ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور وفات ربیع الاول میں پیر کے روز ہوئی تھی۔ البتہ تاریخوں میں اختلاف ہے۔ ولادتِ مبارکہ کے بارے میں کسی نے ۲، کسی نے ۸، کسی نے ۱۲، اور کسی نے ۱۷ تاریخ لکھی ہے، لیکن جمہور اہلِ سنت کے ہاں مشہور تاریخ ۱۲ ربیع الاول ہے۔ اسی طرح وفات کے بارے میں کسی نے یکم ربیع الاول، کسی نے ۲، اور کسی نے ۱۰ تاریخ لکھی ہے، مگر جمہور اہلِ سنت میں مشہور تاریخ ۱۲ ربیع الاول ہی ہے۔ اہلِ سنّت کی روایات کے مطابق حضورؐ کی وفات اور ولادت کے بارے میں صحابۂ کرام اور اہل بیت کے ہاں نہ کوئی عمل رائج تھا نہ کسی قسم کی تقریبات ہوتی تھیں۔

اہلِ تشیّع کی مشہور کتاب علامہ کلینی کی اصولِ کافی میں بھی تاریخ پیدائش و وفات دونوں ۱۲ ربیع الاوّل ہی درج ہیں۔ لیکن علمائے شیعہ کا اتفاق اس پر ہے کہ تاریخ ولادت ۱۷ ربیع الاوّل اور تاریخ وفات ۲۸ صفر ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، ائمۂ اہل بیت بھی حضورؐ کی ولادت یا وفات کے دن کوئی تقریب منعقد نہیں کرتے تھے۔

یہ تعین کرنا بہت مشکل ہے کہ تاریخوں میں اختلاف کیوں ہوا اور کب ہوا؟

کیا فقہی مسلکوں کے لیے "مذاہب" کا لفظ صحیح ہے؟

سوال: جنوری کے ترجمان القرآن میں آپ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حنفی فرقہ یا شافعی فرقہ کے لیے حنفی مذہب یا شافعی مذہب کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ میرا مذہبی علم ایک عام مسلمان کا سا ہے جو مذہب کو ان فرقہ بندیوں سے کچھ اُوپر تصور کرتے ہیں۔ کیا ہم سب فرقوں کا مذہب ایک نہیں ہے؟

جواب: عربی زبان میں لفظ مذہب کے معنی وہ نہیں ہیں جو اُردو زبان میں ہیں۔ اُردو زبان میں یہ لفظ "دین" کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ لیکن عربی میں یہ SCHOOL OF THOUGHT کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی اور حنفی وغیرہ فرقے نہیں ہیں بلکہ دینِ اسلام کے اندر مسلّمہ مذاہب ہیں۔ ان کے لیے اصطلاحی لفظ مذہب ہی ہے۔ کسی زمانے میں بھی اہلِ علم نے انہیں فرقہ نہیں قرار دیا ہے۔

عُشر و زکوٰۃ اور سرکاری ٹیکسوں میں فرق

سوال: شرعی مسئلہ حل کرنے کے لیے جناب کی رائے مبارک کی ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ ایامِ حال میں ایک مجمع میں عام بحث میں عُشر اور زکوٰۃ کا مسئلہ زیر بحث آ گیا۔ ایک صاحب نے جو عالمِ دین نہیں ہیں، لیکن مطالعہ بہت زیادہ کیا ہے، جج بھی رہ چکے ہیں، فرمایا کہ عُشر دسویں حصہ پیداوار ارضی پر عائد ہوتا ہے، اور زکوٰۃ جمع شدہ دولت کا صرف چالیسواں حصہ ہے۔ لیکن مالیہ اور آبیانہ اراضی کی پیداوار کے نصف پر تشخیص ہوتا ہے۔ زرعی ٹیکس اس کے علاوہ ہے، اور جمع شدہ دولت پر انکم ٹیکس ایک بھاری شرح سے لگایا جاتا ہے۔ یہ سب مالیہ، آبیانہ، زرعی ٹیکس، انکم ٹیکس اور ایک جائداد ٹیکس وصول ہو کر بیت المالِ حکومت میں داخل ہو کر رفاہِ عام یعنی راہ، مدرسے، ہسپتال اور ہر قسم ضروریات عالم پر خرچ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے عُشر اور زکوٰۃ کا دینا اب لازم نہیں آتا۔ میرا اس رائے سے اتفاق نہیں تھا اور اپنی یہ رائے پیش کی کہ اول تو تحصیل اور انکم ٹیکس

کے دفاتر بیت المال کی تعریف ہی میں نہیں آتے۔ دوسرے ان رقوماتِ وصول شدہ کا مصرف حکمِ قرآنی کے مطابق نہیں ہوتا۔ آپ بتائیں کہ میری رائے صحیح ہے یا جج صاحب کی؟

جواب: (از ملک غلام علی صاحب) زکوٰۃ کے متعلق پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ یہ ٹیکس نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور رُکن اسلام ہے، جس طرح نماز روزہ اور حج ارکانِ اسلام ہیں۔ جس شخص نے بھی کبھی قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ قرآن بالعموم نماز اور زکوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے اور اسے اُس دین کا ایک رکن قرار دیتا ہے جو ہر زمانے میں انبیائے کرام کا دین رہا ہے۔ اس لیے اس کو ٹیکس سمجھنا اور ٹیکس کی طرح اس سے معاملہ کرنا پہلی بنیادی غلطی ہے۔ ایک اسلامی حکومت جس طرح اپنے ملازموں سے دفتری کام اور دوسری خدمات لے کر یہ نہیں کہہ سکتی کہ اب نماز کی ضرورت باقی نہیں ہے کیونکہ انہوں نے سرکاری ڈیوٹی دے دی ہے، اسی طرح وہ لوگوں سے ٹیکس لے کر نہیں کہہ سکتی کہ اب زکوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں کیونکہ ٹیکس لے لیا گیا ہے۔ اسلامی حکومت کو اپنے نظام الاوقات لازماً اس طرح مقرر کرنے ہوں گے تاکہ اس کے ملازمین نماز وقت پر ادا کر سکیں۔ اسی طرح اس کو اپنے ٹیکسوں کے نظام میں زکوٰۃ کی جگہ نکالنے کے لیے مناسب ترمیمات کرنی ہوں گی۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ حکومت کے موجودہ ٹیکسوں میں کوئی ٹیکس اُن مقاصد کے لیے اس طرح استعمال نہیں ہوتا جن کے لیے قرآن میں زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اور جس طرح اس کے تقسیم کرنے کا حکم ہے۔

اسلام میں جمہوریت کی اصل حیثیت

سوال: میں امریکہ کی یوٹا اسٹیٹ یونیورسٹی میں ہوں۔ یہاں بہت دنوں سے کچھ ایسے تبصرے ہو رہے ہیں جن کا جواب دینے کے لیے میرا علم ناکافی ہے، اس لیے آپ سے رہنمائی کی درخواست کر رہا ہوں۔ سب سے پہلی بات جو عام طور سے یہاں مسلمان صاحبان کہتے ہیں یہ ہے کہ جمہوریت اوّل تو سرے سے اسلام میں تھی ہی نہیں، اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ لوگوں کی رائے سے حضرت علیؓ نے

بھی اکثریت کا فیصلہ تسلیم کر لیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کا فیصلہ سب کے لیے قابلِ قبول ہونا چاہیے۔ پھر کیوں لوگ مسٹر بھٹو کو حاکمِ وقت مانتے ہوئے اُن کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتے؟ اگرچہ وہی صاحبان یہ بات مانتے ہیں کہ حاکمِ وقت کے فیصلے غلط بھی ہوتے ہیں۔

ایک اور واقعہ کو ایک صاحب نے بہت اچھال رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ابو سفیان جب مسلمان ہوئے تو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اچھے مسلمان ہیں۔ حالانکہ ان ابو سفیان نے ان کے قول کے مطابق حضورؐ کے بعد یہ کہا کہ اب تو خلافت بھی ہاشمی خاندان میں بٹنے لگی۔ کیا ان کی یہ بات صحیح ہے؟

جواب:۔ (از ملک غلام علی صاحب) آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اگرچہ آپ میں دینی معلومات کی کمی ہے مگر آپ دینی جذبات و عزائم سے خالی نہیں ہیں اور جو بات آپ کو معلوم نہیں آپ نے اس کا علم حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کے سوالات کے مختصر جوابات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ یہ بات غلط ہے کہ جمہوریت اسلام میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ سورۂ شوریٰ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں) ظاہر ہے کہ خلافت و امارت، جو مسلمانوں کا اہم ترین معاملہ ہے اس پر بھی یہی اصول لاگو ہوگا کہ خلیفہ مسلمانوں کی رائے عام کے مطابق منتخب ہو اور مشورے سے حکومت کرے۔ لیکن عام رائج الوقت جمہوریت اور اسلام کی جمہوریت میں یہ فرق ہے کہ مغربی جمہوریت میں تو باشندوں کی مجرد اکثریت ہر شے کو جائز و ناجائز اور واجب و ممنوع قرار دے سکتی ہے، مگر اسلام میں مسلمانوں کی اکثریت خدا اور رسولؐ کے حرام کردہ امور کو حلال اور حلال کردہ امور کو حرام نہیں کر سکتی۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی اکثریت اگر چاہے بھی تو وہ کسی قادیانی، کسی عیسائی بلکہ کسی فاسق و فاجر کو بھی اپنا امیر نہیں بنا سکتی۔ اگر بنائے تو اسلام کی نظر میں یہ امارت جائز نہ ہوگی۔ اسی طرح مسلمان اگر سارے مل کر بھی یہ چاہیں کہ زنا یا شراب کو حلال کر دیں تو ان کا فیصلہ کالعدم ہوگا۔ مسلمانوں کے منتخب شدہ امیر کی اطاعت بھی مشروط ہے۔ اگر وہ کوئی حکم خلافِ شریعت دے یا اسلام کے خلاف کوئی قانون بنائے تو مسلمانوں پر اُس کی اطاعت واجب نہیں۔ لیکن مسلمان خلیفہ میں اگر اسلامی صفات موجود ہوں اور اس کا حکم خلافِ شریعت نہ ہو تو اس کی نافرمانی جائز نہ ہوگی۔

۲۔ حضرت ابو سفیان کی طرف جو بات ان لوگوں نے منسوب کی ہے وہ خلافِ واقعہ ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ ہونے پر ابوسفیان نے حضرت علیؓ کو ان کی مخالفت پر اُکسایا اور کہا کہ آپ اٹھیں تو میں آپ کی مدد کروں گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے سختی سے حضرت ابوسفیان کو جواب دیا کہ تم پہلے اسلام اور اہل اسلام کی مخالفت کرتے رہے اور کچھ نہ بگاڑ سکے۔ خدا کی قسم میں حضرت ابوبکرؓ کو خلافت کا اہل سمجھتا ہوں، اور پھر حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ابوسفیان بنی ہاشم کی خلافت پر معترض ہونے کے بجائے اس کے لیے خود کوشش کرنا چاہتے تھے۔

بلوچستان میں منگنی کی رسم

سوال:۔ سارے بلوچستان میں منگنی کی رسم قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے اور منگنی میں تمام شرعی ایجاب و قبول اور خطبۂ نکاح اکثر مواقع پر ہوتا ہے۔ البتہ منگنی کو تمام بلوچستان میں بلکہ بشمول افغانستان ایک نکاح تصور کیا جارہا ہے۔ منگنی کے بعد یہاں دستور ہے کہ سوائے خوراک کے عورت کی تمام دیگر ضروریات منگیتر یعنی مرد مہیا کرتا ہے مگر ایک دوسرے سے پردہ بھی کرتے ہیں اور جب تک شادی نہیں ہوتی پردہ جاری رہتا ہے۔ اب چند عرصہ سے مولوی صاحبان اس منگنی کو، جس میں ایجاب و قبول بھی ہوا صرف ایک وعدہ تصور کرتے ہیں اور فتاویٰ دارالعلوم دیوبند میں بھی متعدد مقامات پر اس منگنی کو صرف ایک وعدہ قرار دیا گیا ہے۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ شادی کے موقع پر بھی خطبۂ نکاح پڑھا جاتا ہے اور ایجاب و قبول ہوتا ہے اس لیے منگنی کے دن جو ایجاب و قبول اور خطبہ ہوتا ہے وہ صرف وعدہ ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ بلوچستان ایک قبائلی علاقہ ہے یہاں اگر ایک لڑکی کا والد یا بھائی منگنی کو صرف ایک وعدہ تصور کرے اور لڑکی اس منگیتر کو نہ دے اور کسی اور جگہ شادی کر دے تو سخت جھگڑا ہوتا ہے بلکہ معاملہ قتل و مقاتلہ تک پہنچ جاتا ہے۔ سارے بلوچستان میں یہ ایک بے چینی اور بے اطمینانی کا سبب بن گیا ہے۔ قبائلی تنازعات چونکہ روزمرہ پیدا ہوتے ہیں اور ہمیشہ اکثر چھوٹے چھوٹے معاملات پر برپا ہوتے رہتے ہیں اس وجہ سے سال میں کئی منگنیاں توڑ دی جاتی ہیں اور فتنہ و فساد کی ایک آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ دوسرے علاقوں میں منگنی کے طریقے کا

ہمیں علم نہیں۔ یہاں کی منگنی پر باقاعدہ دعوت ہوتی ہے۔ سو پچاس یا کم و بیش آدمی مرد کے ساتھ جاتے ہیں۔ لڑکی کا والد ضیافت کرتا ہے یا صرف شیرینی تقسیم کرتا ہے۔ پھر امام باقاعدہ خطبہ پڑھ کر ایجاب و قبول کراتا ہے۔ اب علمائے ان تمام چیزوں کو صرف وعدہ قرار دے دیا ہے اور دارالعلوم دیوبند کا فتوٰی بھی اسی طرح ہے۔ لیکن عوام اس سے بے خبر ہیں کہ منگنی صرف ایک وعدہ ہے۔ اگر عوام کو اس کا علم ہو جائے تو قبائلی اختلافات کی وجہ سے کئی کئی منگنیاں منسوخ کر دی جائیں اور ایک بڑے فتنہ کا امکان ہے۔

یہ امر واقعی ہے کہ اس وقت نہیں بلکہ قدیم زمانے سے منگنی کے روز بھی ایجاب و قبول ہوتا ہے اور پھر شادی کے روز پھر ایجاب و قبول ہوتا ہے یعنی دو مرتبہ ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ منگنی کے بعد اگر زوجین میں افتراق ہو تو منگیتر باقاعدہ طلاق دیتا ہے۔

جواب:- (از ملک غلام علی صاحب) آپ نے بلوچستان میں منگنی کی رسم کے متعلق جو تفصیلات لکھی ہیں وہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکیں۔ تاہم جو ایجاب و قبول رکن نکاح ہے اور جس سے نکاح منعقد ہوتا ہے۔ اس کی ضروری تفصیل درج ذیل ہے:-

ایجاب و قبول کے لیے ضروری ہے کہ فریقین عاقدین خود بالغ ہوں تو وہ خود، یا اُن کے وکیل ان کی اجازت سے اُن کی طرف سے ایجاب و قبول کریں اور اگر فریقین یا ان میں سے ایک نابالغ ہو تو نابالغ کے مرد اولیاء نابالغ کی طرف سے ایجاب و قبول کریں۔

ایجاب و قبول میں سے کم از کم ایک کے الفاظ بصیغہ ماضی ادا ہوں۔ مثلاً ایک کہے کہ میں نے اپنا یا اپنی موکلہ کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا اور دوسرا فریق کہے کہ میں نے قبول کیا یا منظور کیا۔ اگر نکاح کا لفظ استعمال نہ ہو تو یہ ضروری ہے کہ اس کا کوئی ہم معنی معروف لفظ استعمال کیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ میں نے تمہیں اپنی زوجہ یا بیوی بنا لیا یا اپنا خاوند یا شوہر بنا لیا، یا کوئی اور ایسا لفظ ہو جس سے متکلم نے نکاح مراد لیا ہو اور کوئی قرینہ یہ متعین کر دے کہ یہاں نکاح ہی مراد ہے اور گواہان نکاح بھی ان الفاظ سے یہی سمجھیں کہ نکاح منعقد ہو گیا ہے۔

اگر نکاح کے اِن ضروری ارکان و شرائط کی تکمیل نہ ہو تو محض ضروریات مہیا کرتے رہنا، پردہ کرنا یا نہ کرنا، خطبۂ نکاح پڑھ دینا، وعدۂ نکاح کر دینا ان چیزوں سے نکاح منعقد نہیں ہو جاتا۔ آپ نے

منگنی کے جس ایجاب و قبول کا ذکر کیا ہے اس کی تفصیل آپ نے نہیں بتائی۔ بہرحال مذکورہ بالا تفصیل کے مطابق جب تک نکاح کے لیے ایجاب و قبول نہ ہو، محض وعدہ اور بات چیت کو ایجاب و قبول کا نام دینے سے نکاح کا انعقاد نہیں ہو سکتا۔ صرف منگنی کے بعد طلاق دینا بھی بالکل لغو ہے۔ جب تک نکاح نہ ہو، طلاق کیسی ہو گی۔

منگنی کی رسم کے متعلق ایک اور سوال

سوال: مندرجہ ذیل مسئلہ میں آپ کی رہنمائی کا خواستگار ہوں۔ زید اور بکر نے اپنی بہن کا رشتۂ نکاح برضا و رغبت عمرو سے طے کیا۔ چنانچہ منگنی ہوئی جس میں ایجاب و قبول ہوا، مٹھائی تقسیم ہوئی۔ مہر کا ایک حصہ دیا گیا اور منگنی کے دیگر رسومات بھی ہوئے۔ دونوں بھائیوں میں سے اس مجلس میں صرف بکر موجود تھا۔ بعد میں دونوں بھائیوں نے کہا کہ منگنی کو ہم تسلیم نہیں کرتے۔ یہ تو صورتِ مسئلہ ہے۔ یہاں بلوچستان میں عرفِ عام یہ ہے کہ منگنی کے بعد کشت و خون لازمی ہے، اگر فریقین میں سے کوئی انکار کرے۔ لڑکا منگنی کے بعد لڑکی کو اپنی بیوی سمجھتا ہے اور لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور پھر قبائلی بنیاد پر یہ فساد آگے بڑھ جاتا ہے۔ ویسے نکاح کی رات پھر خطبہ اور ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ فتویٰ دارالعلوم دیوبند میں مولانا مفتی شفیع صاحب نے منگنی کو ایک وعدہ قرار دیا ہے، بلا عذر شرعی انکار کرنے والے کو گنہگار کہا ہے اور اس سے زائد اس کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کی ہے۔ انہوں نے ابوداؤد کی ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اب عرض یہ ہے کہ اگر منگنی کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہاں اس قبائلی علاقہ میں ایک فتنہ اور کشت و خون کا مسئلہ چل نکلتا ہے۔

جواب: آپ نے معاملے کی جو نوعیت بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعی احکام سے ناواقفیت کے باعث بلوچستان میں رسم و رواج نے منگنی اور نکاح کو خلط ملط کر دیا ہے۔ اس کی اصلاح کے لیے بلوچستان کے اہل علم اور بااثر لوگوں کو کوشش کرنی چاہیے۔ اصلاح کی صحیح صورت یہ ہے کہ منگنی کے وقت کوئی ایجاب و قبول نہ کیا جائے اور فریقین باہم صرف یہ وعدہ کریں کہ وہ لڑکے اور لڑکی کا نکاح کریں گے۔ ایجاب و قبول اُس موقع پر ہونا چاہیے جسے اہل بلوچستان شادی کہتے ہیں۔ اُس وقت شرعی طریقے پر باقاعدہ نکاح ہونا چاہیے اور لڑکی کو صرف اس نکاح

کے بعد ہی لڑکے کی بیوی قرار دینا چاہیئے۔ یہ بات بلا شبہ درست ہے کہ عذر شرعی کے بغیر منگنی کو توڑ دینا جائز نہیں ہے۔ لیکن یہ صرف وعدے کی خلاف ورزی ہے۔ اسے نکاح توڑ دینے کا ہم معنی نہ سمجھنا چاہیئے۔ محض منگنی ہونے سے کوئی عورت کسی مرد کی بیوی نہیں بن جاتی۔ یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ منگنی کے وقت بھی نکاح کی طرح ایجاب وقبول کیا جاتا ہے۔ اس طریقے کو اگر بند کر دیا جائے اور "شادی" (یعنی نکاح) کے وقت ہی خطبۂ نکاح اور ایجاب وقبول ہوا کرے تو لڑائی جھگڑے کی نوبت پیش نہ آئے گی۔

(بقیہ روداد ابتلاء: احمد رائف مصری)

تُل گئے تھے ——— گویا ان روز ہائے سیاہ میں زمانے کی رفتار تھم چکی تھی!!

تفتیشی بیرک کے اندر میں تین روز پڑا رہا۔ کبھی میں تعذیب کا نشانہ بنا دیا جاتا اور کبھی مجھے فراموش کر بیٹھتے۔ وہ جب مجھے بھول جاتے تو میں اس وقت بیرک کے فرش پر ننگ دھڑنگ بیٹھا ہوتا۔ یقین جانیے، مادر زاد ننگا۔ (باقی)

تصحیح اغلاط

تفہیم القرآن جلد چہارم میں حسب ذیل تین مقامات کی تصحیح کر لی جائے:۔

——— صفحہ ۲۳۶، حاشیہ کی پہلی سطر میں تتلقاھم کے بجائے یتلقاھم لکھا جائے

——— صفحہ ۲۴۷ سطر ۳۔ نہ مانیں گے کے اُوپر حاشیے کا نمبر ۵ درج کر لیا جائے۔

——— اسی صفحہ کی سطر ۶ میں سورۂ سبا کے بجائے سورۂ السجدہ لکھا جائے۔

(بقیہ اشارات) دار و مدار ان بے ضمیر عناصر پر تھا۔ اگر وہ باضمیر، دیانتدار اور خوددار لوگوں کو ساتھ لے کر چلنا پسند کرتے اور اُن کے مشوروں سے اُمورِ مملکت چلاتے تو انہیں اپنے متکبرانہ مزاج اور آمرانہ ذہن کو تبدیل کر کے اپنی طبیعت میں اعتدال، انکسار، تحمل اور بردباری پیدا کرنی پڑتی مگر اس تغیر کو اُن کی خود پسند شخصیت کا موجودہ سانچہ کسی قیمت پر بھی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی اُفتادِ طبع کی بنا پر خودغرض، طامع اور ظالم افراد کی سرپرستی کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ یہی لوگ اُن کے سامنے ہر حال میں سرِ تسلیم خم کر کے اُن کی حد سے بڑھی ہوئی انانیت کی تسکین کا سامان فراہم کر سکتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ دیانتدار، بےغرض اور مخلص لوگ یہ خوشامدانہ روش تو کسی طور پر بھی اختیار کرنے پر تیار نہ ہو سکتے تھے۔ اِس موقع پر جمال عبدالناصر کے ایک معتمد رفیق کار عبدالحکیم عامر کا قول یاد آرہا ہے۔ وہ اپنی سرگزشت میں جو "پاکستان ٹائمز" میں شائع ہوئی، یہ واقعہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے ناصر سے یہ کہا کہ حضور! انقلاب کے وقت ہم نے عوام سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم انہیں بددیانت افراد کے چنگل سے نجات دلائیں گے، تو اب ہمیں اِس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے کوئی موثر کارروائی کرنی چاہیے۔ اِس پر جمال عبدالناصر نے کہا: عامر! کیا تم اقتدار سے الگ ہونا چاہتے ہو؟ عامر نے حیران ہو کر پوچھا: وہ کیسے؟ تو ناصر نے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے گرد ایماندار لوگوں کو جمع کر لیں جو ہمارے ہر قول و فعل پر بےلاگ تنقید کرتے رہیں اور اس طرح ہر قدم پر ہمارے لیے رکاوٹیں کھڑی کر دیں؟ ایسے افراد کے ساتھ ہم اپنے عزائم کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ہمارے لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ ہم طالع آزماؤں کو اپنے جلو میں لے کر چلیں اور انہیں ناجائز مفادات حاصل کرنے کے مواقع فراہم کریں تاکہ وہ ہمارے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کر سکیں اور ہر حال میں ہماری تائید کرنے پر مجبور رہیں۔ باضمیر آدمی کو آسانی کے ساتھ بے بس نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے مقابلے میں بے ضمیر آدمی اول سے آخر تک بے بس ہی ہوتا ہے اور جبینِ اقتدار کے تیور دیکھ کر اپنے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کو تبدیل کرتا چلا جاتا ہے۔ اِس لیے اُس سے کسی قسم کا کوئی خدشہ نہیں ہوتا۔ جمال عبدالناصر کا یہ تجزیہ کہاں تک درست ہے یہ الگ بحث ہے لیکن اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دُنیا کا ہر آمر اِسی انداز پر سوچتا اور اِسی نہج پر عمل کرتا ہے۔